U1
Sh 730 T

[illegible]

[illegible]

14

طاقِ ابرو

شہرت بخاری

کلاسیک

جملہ حقوق محفوظ

ناشر

آغا امیر حسین

کلاسیک - بیرون لوہاری - لاہور

طابع - آردو پریس - میکلوڈ روڈ - لاہور

سرورق - نوروز پریس آردو بازار - لاہور

عمل سرورق - تفضل ضیا

۱۹۵۸-۱۲-(۱)

CHECKED

J. & K. UNIVERSITY LIB.
Acc. No 55064
Date 20.XI.64

ST 01

ALLAMA IQBAL LIBRARY
55064

۲۲۲۸

ترتیب

حلقۂ اربابِ ذوق کے نام

"تیرا انجھ کو سونپتے کیا لاگت ہے مور"

"مشغولِ حق ہوں بندگیٔ بوتراب میں"

مسیح و خضر فسانہ ہوئے، زمانہ ہوا
فروغِ محفلِ ہستی ترا چراغ رہا
ترا مقام نہ پایا ہے اور نہ پائے گی
اسیرِ حلقۂ ظلمت، یہ عقلِ آبلہ پا
ترے اشارے نے روکی ہے وقت کی آندھی
تری نگاہ نے ذرّوں کو آفتاب کیا

مری نگاہ، مری فکر، میری بات غلط
تو کارساز ہے، کار آفریں ہے، کارکشا

وہ اجنبی ہوں کہ خود کو بھی اجنبی جانوں
مگر خیال ترا، ذکر تیرا، نام ترا

کہوں تو کس سے کہوں اور سنے تو کون سنے
نصیبِ اہلِ دو عالم ہے گوشِ ناشنوا

غزل کے پردے میں کیا کیا نہ زخم فاش کئے
پر اک تبسمِ پنہاں بھی جگمگا نہ سکا

یہ چند اشک کہ ہیں دُردِ ساغرِ غفلت
یہی متاع ہے میری، یہی مری دُنیا
قبول ہوں تو ہیں رشکِ خزینہ ہائے گہر
تری جناب سے مایوس کوئی بھی نہ گیا
مری رگوں میں ترا خون ہے یہ کیا کم ہے
نہ جامِ جم کا ہُوں طالب نہ تاجِ خسرو کا
زمانہ کیا مری قیمت پرکھ سکے شہرت
ہیں خاکِ پائے سگِ کوچۂ علیؑ ٹھہرا

"کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا
سو ٹھہرا ہے یہی اب فن ہمارا"

چمن میں ایک ہے نشیمن ہمارا
رہے گا یاد پاگل پن ہمارا

یہاں بلبل نہ گل، سبزہ نہ کانٹا
ہمارے دم سے ہے گلشن ہمارا

کہیں بجلی، کہیں شعلے، کہیں راکھ
رہا ہے دیدنی ساون ہمارا

تمہاری راہ میں یوں کھو گئے ہیں
کہ ڈھونڈے گی اجل مسکن ہمارا

فلک کو کیا پڑی تھی دشمنی کی
ہمارا پیار تھا دشمن ہمارا

غمِ دوراں، غمِ جاناں، غمِ دل
چراغِ یاس ہے روشن ہمارا

گئے ہیں ان گنت منعم اِدھر سے
مگر پھیلا رہا دامن ہمارا

وہ شمعیں ہوں کہ بادل، سب فسانے
لہو رونا ہے شہرتِ فن ہمارا

Jammu & Kashmir University Library
Accession No. 55064

نقدِ ترتیبِ چمن ہے ہم تک
قصۂ دار و رسن ہے ہم تک
کل انہیں پھول کہے گی دُنیا
یعنی کانٹوں میں چُبھن ہے ہم تک
باغباں خاک اُڑائیں گے یہاں
جلوۂ سرو و سمن ہے ہم تک

چھنگ و نے ہوں گے نہ پروانہ و شمع

ساری محفل کی پھبن ہے ہم تک

سرد ہو جائے گا بازارِ وفا

طلبِ رنج و محن ہے ہم تک

مسکراہٹ کو ترس جائیں گے

اُن کے ماتھے پہ شکن ہے ہم تک

کس قدر سادہ ہیں دیوانے بھی

سوچتے ہیں کہ چمن ہے ہم تک

کوئی سایہ بھی نہ کام آئے گا
آج وہ دھوپ چڑھی ہے دل میں
بعد مُدت کے جو دیکھا تو کھُلا
اپنی تصویر کھنچی ہے دل میں
کس طرف دیکھیں گے کیا دیکھیں گے
زندگی ساری کٹی ہے دل میں
عمر بھر شعر کہے ہیں شہرتؔ
دل کی ہر بات رہی ہے دل میں

○

دھوپ کتنی کڑی ہے، کیا ہوگا!
راہ ساری پڑی ہے، کیا ہوگا
کیسی منزل، کہاں کا ذوقِ سفر
ایک سولی گڑی ہے، کیا ہوگا
دل میں دھڑکن نہ آنکھ میں آنسو
کیسی نازک گھڑی ہے، کیا ہوگا

وہ جفا کیا، وفا سے بیگانے
آنکھ کن سے لڑی ہے کیا ہوگا

دل کو اُن سے نباہ کرنی ہے
دھوم جن کی بڑی ہے کیا ہوگا

دن تو جوں توں گزر گیا شہرتؔ
رات سر پہ کھڑی ہے کیا ہوگا

○

جب وہ تصویر ادا یاد آئے
کیا فراموش ہو گیا یاد آئے
اپنے آئینے میں دیکھا ہم نے
تم باندازِ وفا یاد آئے
جب کوئی ابر کا ٹکڑا اُبھرا
دشت کو آبلہ پا یاد آئے

اپنا دھیان آیا تو اک پل دو پل
بھولنے والے سدا یاد آئے

پھول بکسے تو چمن والوں کو
طائرِ نغمہ سرا یاد آئے

یوں ترا نام ہے لب پر جیسے
آخری وقت خدا یاد آئے

آنکھ کھولی تو فلک تھا شہرتؔ
یاد آئے بھی تو کیا یاد آئے

○

مُطرب نے ایسی دُھن میں الاپی مری غزل
ہر گوشۂ خیال میں لو دے اُٹھے کنول

وہ خوابِ نیم لحظہ، یہ بیداریٔ دوام
قربت کی ساری عمر، جدائی کا ایک پل

چنگاریاں سی سالہے بدن میں ہیں شعلہ زن
یعنی یہی ہے میری کہانی کا ماحصل

اک عمر کا ہے ساتھ اُمیدِ شکستہ پا!
منزل تلک نہیں نہ سہی دو قدم تو چل

پہلے بھی ہم سکون سے محرم نہ تھے کبھی
لیکن یہ حشر کب تھا کہ برپا ہے آج کل

اک نشہ اک سرورِ رسا اس میں بھی ہے مگر
دردِ جہاں ہُوا نہ ترے درد کا بدل

شہرت کو تیرے غم نے بالآخر بچا لیا
پیچھے لگی ہوئی تھی بہت دیر سے اجل

○

ہم پی گئے سب ، ہلے نہ لب تک

جی ہار گئے نجومِ شب تک

اشکوں سے فسانہ بن گیا ہے

وہ لفظ کہ آسکا نہ لب تک

برسوں ہوئے قافلے کو گزرے

ہر سمت غبار رہا ہے اب تک

یہ داغ یوںہی رہیں گے روشن
ساری ہے رگوں میں خون جب تک
خوش ہو نہ زمانہ میرے غم پر
آتا ہے یہ دورِ جام سب تک
مے خانے میں سر چھپائیں آؤ
وا ہو درِ کعبہ جانے کب تک
شہرتؔ کوئی شعر ہی سناؤ
اُٹّھیں وہ نقاب لطف جب تک

○

اِسی خیال سے دل کو تسلیاں دے لوں
کہ تیرے دم سے بھی ٹوٹا نہ زندگی کا فسوں

چمن کو بسنے نہ دے گی یہ دل کی ویرانی
میں لاکھ پھول لگاؤں ہزار خارۂ جنوں

گمانِ ہوش ہی کافی ہے یاں خرابی کو
کہ آئینے سے بھی نازک ہے کارگاہِ جنوں

یہ آج کیسی شفق کھل رہی ہے چہرے پہ
تمہاری بات نہ تم سے کہوں تو کس سے کہوں
اِسی سے مجھ کو ملا میری زندگی کا سُراغ
بڑا ستم ہو جو تیرے ستم کی داد نہ دوں
جواب سے کے درد ٹھہر جائے، جی سنبھل جائے
تو ساری عمر تری آرزو کا نام نہ لوں
اُنہیں کے شعلوں سے قائم ہے سانس میں گرمی
خدا وہ دن نہ دکھائے کہ اپنی آگ جلوں

کچھ اس نظر سے مجھے دیکھتے ہیں اہلِ چمن
شہیدِ حسرتِ گل جیسے ایک میں ہی تو ہوں
غروب ہوتے چراغو! ذرا ٹھہر جاؤ
یہ اک اُمید جو دم توڑ لے تو میں بھی چلوں
اُنہیں بھلانے کی کوشش نہ کیجئے شہرتؔ
یہ آگ جتنی بجھائیں گے اور ہو گی فزوں

○

مایوسیوں کے قافلے اُترے سحر کے ساتھ
دِل بجھ گیا چراغِ سرِ رہگزر کے ساتھ

انجامِ کار خاک سہی، پر یہ کم نہیں
گلشن میں جان آ گئی رقصِ شرر کے ساتھ

لفظوں میں رچ سکے گی نہ کیفیّتِ فراق
شاید ہمیں بھی جانا پڑے نامہ بر کے ساتھ

تاروں میں خنکیاں ہیں نہ پھولوں میں گرمیاں
دونوں جہاں اُجڑ گئے اِس ایک گھر کے ساتھ

جاں دادگانِ سرو و صنوبر کو کیا خبر
بادِ سموم بھی ہے نسیمِ سحر کے ساتھ

جس دل نے مہر و ماہ کو مایوس کر دیا
روشن ہُوا تو ایک شعاعِ نظر کے ساتھ

کھو کر نہ ہی تلاش میں مرجھا چلے تھے ہم
کیا کھِل گئے ہیں آج خود اپنی خبر کے ساتھ

شہرت سکوں تو پھر بھی مُیسّر نہ ہو سکا
ہر چند واسطہ نہ رکھا خیر و شر کے ساتھ

بزم سنواروں غزلیں گاؤں
جینے کے انداز بناؤں
ہر دم رُو رُو خون کے آنسو
کیوں آنکھوں کی آب گنواؤں
کب تک دل کے بہکانے پر
تارے گن گن رین بتاؤں

اُن کو میرا دھیان نہیں ہے
میں کیوں اپنی جان گنواؤں
میرا غم کس نے کھایا ہے
میں کیوں دنیا کا غم کھاؤں
سب سے ترکِ تعلق کر لوں
خود سے رسم و راہ بڑھاؤں
مرنے والوں کو مرنے دوں
جلنے والوں کو اپناؤں
ہر میّت کے سرہانے شہرت
نغمے چھیڑوں جشن مناؤں

جب تجھے بھولنا چاہا دل نے
اک نئے غم کی سزا دی ہم نے

کوئی غنچہ کسی گوشے میں کھِلا
باغ میں دھوم مچا دی ہم نے

کیسی آباد تھی دُنیا شہرت
کیسی سنسان بنا دی ہم نے

○

کوٹھے اُجاڑ، کھڑکیاں چُپ، راستے اُداس
چھلتے ہی اُن کے کچھ نہ رہا زندگی کے پاس
دو پل برس کے ابر نے دریا کا رُخ کیا
تپتی زمیں سے پہروں نکلتی رہی بھڑاس
مٹی کی سوندھ جاتے ہوئے ساتھ لے اُڑی
ڈالی کا لوچ، پات کی سبزی، کلی کی باس

اشکوں سے کس کو پیار ہے آہوں سے کس کو اُنس

لیکن یہ دل کہ جس کو خوشی آسکی نہ راس!

ہشیار اے نویدِ اجل لُٹ نہ جائیو!

پھرتا ہے کوئی آٹھ پہر دل کے آس پاس

آنسو ہوئے ہو، زہر ہو، آبِ حیات ہو

جز خونِ آرزو نہ بجھے زندگی کی پیاس!

جیسے کبھی تعلقِ خاطر نہیں رہا

یوں روٹھ کر چلی گئی شہرت ہر ایک آس

○

کاش یہ باغ بیاباں ہوتے

ہم چراغِ تہِ داماں ہوتے

کیا قیامت ہے کہ ہوں سجدہ گزار

شرم آئے جنہیں یزداں ہوتے

دید کا لطف تو جب تھا کہ ہمیں

آئنے دیکھ کے حیراں ہوتے

راکھ ہوتے مگر اشکوں کے دیئے

آندھیوں میں بھی فروزاں ہوتے

اس طرح جذب وہ ہوتے ہم میں

اپنے سائے سے گریزاں ہوتے

نگۂ شوق کے طالب رہتے

بے نیازِ سروساماں ہوتے

گدگداتا انہیں اپنا جو خیال

صورتِ زلف پریشاں ہوتے

عشق و غارتگری اک ہوتے اگر

شہر کے شہر بیاباں ہوتے

سرِ ہر خار پہ خوشبو روتی
روکشِ دشت گلستاں ہوتے

اہلِ گریہ ہی پہ موقوف نہیں
شفقیں ہونٹ بھی ویراں ہوتے

آج یہ نغمہ سرایانِ جہاں
ہمہ تن نالہ و افغاں ہوتے

رات کس چین سے کٹتی شہرت
تم اگر آج غزل خواں ہوتے

اک خواب ہے سُن لے کہ ہے سامان خوشی کا
یہ ذکر نہ تیرا ہے نہ میرا نہ کسی کا
جس دیس کے دریاؤں کا حاصل ہوں بگولے
شکوہ کرے کیا کوئی وہاں تشنہ لبی کا
مدت سے کہ جیسے کوئی پتھر ہو پڑا ہوں
اک ذرہ بھی مونس نہ ہوا تیری گلی کا

مُنہ پھیر دیا موت کا اربابِ خرد نے
چارہ نہ ہوا کوئی مگر دل کی لگی کا

جز آبلۂ پا نہ رہا زادِ سفر میں
انجام مقدر تھا یہی برق روی کا

خوابوں میں، خیالوں میں، نگاہوں میں تھیں تم
احساس رہا پھر بھی کسی شے کی کمی کا

صحرا میں ہوں لیکن وہی وحشت، وہی تنگی
نقشہ ہے وطن میں بھی غریب الوطنی کا

بے دادِ زمانہ سے فسردہ نہ ہو پیارے
یہ دور ہے کج فہمی و کوتہ نگہی کا

معمور ہے گلشن کی فضا زاغ و زغن سے
زنجیرِ مسلسل ہے صلہ نغمہ گری کا

محفل کی سجاوٹ ہیں وہی جن کی زباں پہ
عنوان کسی کا ہے تو افسانہ کسی کا

شہرت یہ مرا خرقۂ صد چاک نہ دیکھو
دنیا مری ٹھوکر میں ہے بندہ ہوں علیؑ کا

حرف جو وردِ زباں رہتے ہیں
وہی محتاجِ بیاں رہتے ہیں

ہم بجز دودِ پریشاں نہ رہے
خار و خس کے بھی نشاں رہتے ہیں

اسی احساس پہ زندہ ہوں کہ وہ
میری جانب نگراں رہتے ہیں

بزمِ جاناں ہو کہ بازارِ حیات
ہم بہر حال گراں رہتے ہیں

باہمہ خرقۂ صد ہا پیوند
ہمسرِ کج کلہاں رہتے ہیں

میں نہیں ہوں نہ سہی شعر مرے
رونقِ بزمِ بتاں رہتے ہیں

اپنی سُدھ ہے نہ جہاں کی شہرت
ان دنوں آپ کہاں رہتے ہیں

○

ایسے مقام بھی غمِ جاناں میں آ گئے
آنسو پلٹ کے سینۂ سوزاں میں آ گئے

اپنے ہی دل کی دھڑکنیں خود پکارتی ہیں آج
ہم گھر میں آ گئے کہ بیاباں میں آ گئے

وہ دکھ کہ جن پہ وسعتِ عالم بھی تنگ تھی
سمٹے تو ایک اشکِ پشیماں میں آ گئے

شاموں میں رنگ، صبحوں میں خوشبو نہیں رہی

یہ کیا کیا کہ سایۂ درماں میں آ گئے

دل ایسا شہر جن کی نظر میں نہ جچ سکا

مایوس ہو کے دیدۂ حیراں میں آ گئے

کلیاں کہاں کی یاں تو بگولا نہیں کوئی

یا رب یہ آج کیسے گلستاں میں آ گئے

یوں کھل گئے ہیں دل کے پھپھولوں سے جیسے ہم

ماتم سرا سے بزمِ چراغاں میں آ گئے

تاروں کے ڈوبتے ہی اندھیروں نے آ لیا

شعلے لپٹ کے دامنِ مژگاں میں آ گئے

کس چیز کے لئے ہوسِ گلستاں رہے

پھولوں کے رس تو خارِ مغیلاں میں آ گئے

اپنا تو ذکر کیا ہے ترے لطفِ عام سے

آئینے ٹوٹ کر دلِ حیراں میں آ گئے

شہرت وہ آنچ ہے کہ رُکی جا رہی ہے سانس

سورج پگھل کے جیسے رگِ جاں میں آ گئے

○

فریاد کا کیا ذکر ہے ، دھڑکا نہیں جاتا
دل کا ہوا وہ حال کہ دیکھا نہیں جاتا

ہر سانس میں آندھی ہے تو ہر اشک میں دریا
اب اور ترے شہر میں ٹھہرا نہیں جاتا

چلمن ہو کہ دیوانے کی درزیں ہوں کہ برقع
جلووں کا وہ طوفاں ہے کہ سنبھلا نہیں جاتا

ہر قطرے میں ہے کوثر و تسنیم کی خوشبو
ڈھونڈے سے مگر زہر بھی پایا نہیں جاتا

ہے دشت میں جل تھل تو سمندر میں بگولے
غنچے سے کھِلا شعلے سے بھڑکا نہیں جاتا

ہونٹوں کو بھی سینا ہو تو سوئی نہیں ملتی
یوں کونسا نشتر ہے جو بخشا نہیں جاتا

یہ لوگ کہ ہیں کوچہ و بازار کی رونق
سائے کے سوا کچھ انہیں سمجھا نہیں جاتا

ہنستے ہیں جو خود بھی تو اُمڈ آتے ہیں آنسو
مرجاتے اگر کوئی تو رویا نہیں جاتا

اب کوئی بھی لیلیٰ نہیں شرمندۂ محمل
اب کوئی بھی مجنوں سوئے صحرا نہیں جاتا

کوفے میں حسین ابنِ علی در خورِ سجدہ
منصور کو سولی پہ چڑھایا نہیں جاتا

ہر مکّے میں بو جہل ہے، ہر لنکا میں راون
کوئی ہو کسی کو یہاں پوچھا نہیں جاتا

منزل وہ نظر میں ہے کہ پائی نہیں جاتی
کام اُن سے پڑا ہے جنہیں چھوڑا نہیں جاتا

ہر ذرّے میں سورج کی شعاعوں کو سجایا
لیکن اُفقِ دل سے اندھیرا نہیں جاتا

سیکھا ہے وہ نغمہ کہ سمجھتا نہیں کوئی
آتا ہے وہ جادو کہ جگایا نہیں جاتا

ہاں کوئی خدا اے مری تخئیل! کہ اب اور
انسان کی تصویر کو پوجا نہیں جاتا

شہرت نہیں لپکا ہے بھٹک جانے کا ورنہ
منزل کی طرف کون سا رستہ نہیں جاتا

یا ہم نہ تھے تو انجمنِ گل اُجاڑ تھی
یا حاصلِ تلاش نہیں ایک خار بھی

راس آچلی تھیں دل کو خیالوں کی بستیاں
لے آیا پھر کوئی سوئے صحرائے زندگی

اپنے بھی خط و خال نمایاں نہیں رہے
یارب تجھے نہ یوں کسی سپنے کی روشنی

چھیڑی کبھی غزل کبھی نالہ بپا کیا
لیکن کسی طرح نہ گئی دل کی بے کلی

کیا کیا ہنسی ہے یورشِ ظلمت پہ رات بھر
جو شمع سہ سکی نہ کرن آفتاب کی

بیتے دنوں کی یاد نے سب کچھ بھلا دیا
کیا برق تھی کہ جسم کے رگ و پے میں رہ گئی

آرائشِ جمال سے فرصت نہیں اُنہیں
پھرتے ہیں پاگلوں کی طرح ہم گلی گلی

کیا کیجیے تغافلِ احباب کا گلہ
جب اپنی کوئی آس بھی اپنی نہ رہ سکی

اہلِ جنوں یہ گوشہ نشینی کہاں تلک
بادل سے بجھ سکے گی نہ کانٹوں کی تشنگی

شہرت اور اس کو جستجوئے سایۂ اجل
لاہور تجھ سے ایسی توقع نہ تھی کبھی

○

سُورج کے ہوتے ایک نظر بھی نہ اُٹھ سکی
دن بھر رہی ہے ورنہ چراغوں میں روشنی
کملا گئی ہے گرچہ اُمیدوں کی ہر کلی
پاتا ہوں پھر بھی تیرے تصوّر میں تازگی
اب تک گھنیری رات کے سنسان دشت میں
سُنتا ہوں تیرے پاؤں کی آہٹ کبھی کبھی

دُکھ بن کے ہے رواں رگ و پے میں لہو کے ساتھ

وہ روشنی جو حدِّ نظر سے گزر گئی

آواز کے سوا مری قسمت میں کچھ نہیں

ورنہ سبھی نے دیکھی ہے وہ شکل چاند سی

اب کوئی پوچھ بیٹھے تو کیا دیجیے جواب

کس کے لئے بجھائی گئی شمعِ زندگی

بُلبُل اسیرِ نالہ و شبنم غریقِ اشک

سب کچھ ہُوا ـــ مگر نہ گئی پھول کی ہنسی

پل بھر ترے خیال سے غافل نہیں رہا

شہرت کہ جس نے اپنی خبر بھی کبھی نہ لی

وہ تصوّر کہ ترے پیار نے بخشا پیارے

مر گئے ہوتے اگر ساتھ نہ ہوتا پیارے

کوئی اس داغ کا محرم نہ ملا پر نہ ملا

چاند سے شمع تلک سب کو دکھایا پیارے

ہیر رانجھے کے فسانوں پہ تڑپنے والے

نام بھی سُننا نہیں چاہتے اپنا پیارے

صاحبِ گوش کوئی ہے تو نہیں صاحبِ دل
اب کسے کون کہے کون سُنے گا پیارے

اب جہاں دشت کے سناٹے لرز اُٹھتے ہیں
تھا وہاں نالہ بھی صورت گرِ نغمہ پیارے

اب جہاں ہونٹ بھگونے کو نہیں قطرۂ خوں
کل وہاں منہ کو چھپا یا گئے دریا پیارے

یہ وہی پھول زمینیں ہیں جہاں ڈھونڈنے سے
آبلہ پاؤں کو ملتا نہیں کانٹا پیارے

کیسی سنسان ہیں جاڑوں کی یہ راتیں شہرتؔ
دل میں وہ شورِ قیامت ہے کہ توبہ پیارے

جانتا ہوں کہ یہاں سرد ہے بازارِ سخن
میری غزلوں کی تپش کون سہے گا پیارے

ایک چشمہ ہے کہ اُبلا ہی چلا آتا ہے
ایک جھگڑا ہے کہ روکے نہیں رُکتا پیارے

دیکھئے اور ابھی رنگ دکھائے کیا کیا
وہ تصوّر کہ ترے پیار نے بخشا پیارے

○

حاصلِ وہم و گماں ہیں ہم لوگ
کسے معلوم کہاں ہیں ہم لوگ
کوئی مقصد ہے نہ منزل کوئی
لکۂ ابرِ رواں ہیں ہم لوگ
کل تلک ہم سے جواں تھی دنیا
آج بے نام و نشاں ہیں ہم لوگ

چہرہ افروزِ بہاراں تھے کبھی
داغِ دامانِ خزاں ہیں ہم لوگ

شررِ نغمہ نہ ڈھونڈو ہم میں
مدفنِ آہ و فغاں ہیں ہم لوگ

اب بھی دل سے اُٹھیں شعلے بھی
آپ ہی اپنا جہاں ہیں ہم لوگ

باہمہ صُحبتِ مہتاب و نجوم
تیری جانب نگراں ہیں ہم لوگ

راکھ ہو جائیں مگر اُف نہ کہیں
عصمتِ دیدہ وراں ہیں ہم لوگ

رفتگاں میں سے نہ لوٹا کوئی
کس توقع پہ رواں ہیں ہم لوگ

کتنی دلچسپ ہیں باتیں اپنی
کیا خبر کس کی زباں ہیں ہم لوگ

حادثے سارے اہم ہوتے ہیں
کشتۂ حسنِ بیاں ہیں ہم لوگ

ہمیں کیا پائے گا کوئی شہرت
اپنی آنکھوں سے نہاں ہیں ہم لوگ

چاروں اور گھنے بادل
اور ہم راکھ ہوئے جل جل
کون سے دیپ کی لو ڈوبی
چاند نگر میں ہے ہل چل
یوں آتا ہے دھیان ترا
جیسے دور بجے چھاگل

تجھ بن دریا، تجھ بن جُگ

ایک اک آنسو، ایک اک پل

سانس کی گرمی سے جل جائے

مورکھ دل ہے بڑا کومل

کانپ اُٹھے گی پُھلواری

دیکھ کلی کو یوں نہ مسل

کس کے شعر بیں جھکے گا

میرے بعد ترا کاجل

اس گھنگھور اُداسی میں

جی شہرت جی کوئی غزل

زندگی آن رکی ہے دل میں
ابکے وہ ٹیس اُٹھی ہے دل میں

پھر چراغوں کی لویں ڈوب گئیں
پھر تری بات چلی ہے دل میں

وہ دھواں ہے کہ گھُٹا جاتا ہے دم
کونسی آگ بجھی ہے دل میں

کوئی سایہ بھی نہ کام آئے گا
آج وہ دھوپ چڑھی ہے دل میں
بعد مُدت کے جو دیکھا تو کھُلا
اپنی تصویر کھنچی ہے دل میں
کس طرف دیکھیں گے کیا دیکھیں گے
زندگی ساری کٹی ہے دل میں
عمر بھر شعر کہے ہیں شہرت
دل کی ہر بات رہی ہے دل میں

○

دھوپ کتنی کڑی ہے، کیا ہوگا!
راہ ساری پڑی ہے، کیا ہوگا

کیسی منزل، کہاں کا ذوقِ سفر
ایک سولی گڑی ہے، کیا ہوگا

دل میں دھڑکن نہ آنکھ میں آنسو
کیسی نازک گھڑی ہے، کیا ہوگا

وہ جفا کیا، وفا سے بیگانے
آنکھ کن سے لڑی ہے، کیا ہوگا

دل کو اُن سے نباہ کرنی ہے
دھوم جن کی بڑی ہے، کیا ہوگا

دن تو جوں توں گزر گیا شہرتؔ
رات سر پہ کھڑی ہے، کیا ہوگا

○

جب وہ تصویرِ ادا یاد آئے
کیا فراموش ہو کیا یاد آئے
اپنے آئینے میں دیکھا ہم نے
تم باندازِ وفا یاد آئے
جب کوئی ابر کا ٹکڑا اُبھرا
دشت کو آبلہ پا یاد آئے

اپنا دھیان آیا تو اک پل دو پل
بھولنے والے سدا یاد آئے
پھول مہکے تو چمن والوں کو
طائرِ نغمہ سرا یاد آئے
یوں ترا نام ہے لب پر جیسے
آخری وقت خدا یاد آئے
آنکھ کھولی تو فلک تھا شہرتؔ
یاد آئے بھی تو کیا یاد آئے

○

مُطرب نے ایسی دُھن میں الاپی مری غزل

ہر گوشۂ خیال میں لو دے اُٹھے کنول

وہ خوابِ نیم لحظہ، یہ بیداریٔ دوام

قربت کی ساری عمر، جدائی کا ایک پل

چنگاریاں سی سارے بدن میں ہیں شعلہ زن

یعنی یہی ہے میری کہانی کا ماحصل

اک عمر کا ہے ساتھ اُمیدِ شکستہ پا!
منزل تلک نہیں نہ سہی دو قدم تو چل

پہلے بھی ہم سکون سے محرم نہ تھے کبھی
لیکن یہ حشر کب تھا کہ برپا ہے آج کل

اک نشّہ اک سرور سا اس میں بھی ہے مگر
دردِ جہاں ہوا نہ ترے درد کا بدل

شہرت کو تیرے غم نے بالآخر بچا لیا
پیچھے لگی ہوئی تھی بہت دیر سے اجل

○

ہم پی گئے سب ہلے نہ لب تک

جی ہار گئے نجومِ شب تک

اشکوں سے فسانہ بن گیا ہے

وہ لفظ کہ آ سکا نہ لب تک

برسوں ہوئے قافلے کو گزرے

ہر سمت غبار سا ہے اب تک

یہ داغ یونہی رہیں گے روشن
ساری ہے رگوں میں خون جب تک
خوش ہو نہ زمانہ میرے غم پر
آتا ہے یہ دورِ جام سب تک
مے خانے میں سر چھپائیں، آؤ
وا ہو درِ کعبہ جانے کب تک
شہرتؔ کوئی شعر ہی سناؤ
اُلٹیں وہ نقاب لطف جب تک

○

اِسی خیال سے دل کو تسلّیاں دے لوں
کہ تیرے دم سے بھی ٹوٹا نہ زندگی کا فسوں
چمن کو بسنے نہ دے گی یہ دل کی ویرانی
میں لاکھ پھول لگاؤں، ہزار خارِ جُنوں
گمانِ ہوش ہی کافی ہے یاں خرابی کو
کہ آئینے سے بھی نازک ہے کارگاہِ جنوں

یہ آج کیسی شفق کھل رہی ہے چہرے پر
تمہاری بات نہ تم سے کہوں تو کس سے کہوں

اسی سے مجھ کو ملا میری زندگی کا سُراغ
بڑا ستم ہو جو تیرے ستم کی داد نہ دوں

جواب کے وردِ ٹھہر جائیے، جی سنبھل جائیے
تو ساری عمر تری آرزو کا نام نہ لوں

اُنہیں کے شعلوں سے قائم ہے سانس میں گرمی
خدا وہ دن نہ دکھائے کہ اپنی آگ جلوں

کچھ اس نظر سے مجھے دیکھتے ہیں اہلِ چمن
شہیدِ حسرتِ گل جیسے ایک میں ہی تو ہوں
غروب ہوتے چراغو! ذرا ٹھہر جاؤ
یہ اک اُمید جو دم توڑ لے تو میں بھی چلوں
اُنھیں بھلانے کی کوشش نہ کیجیے شہرتؔ
یہ آگ جتنی بجھائیں گے اور ہو گی فزوں

○

مایوسیوں کے قافلے اُترے سحر کے ساتھ

دِل بجھ گیا چراغِ سرِ رہگزر کے ساتھ

انجامِ کار خاک سہی، پر یہ کم نہیں

گلشن میں جان آ گئی رقصِ شرر کے ساتھ

لفظوں میں رچ سکے گی نہ کیفیّتِ فراق

شاید ہمیں بھی جانا پڑے نامہ بر کے ساتھ

تاروں میں خُنکیاں ہیں نہ پھولوں میں گرمیاں
دونوں جہاں اُجڑ گئے اِس ایک گھر کے ساتھ

جاں دادگانِ سرو و صنوبر کو کیا خبر
بادِ سموم بھی ہے نسیمِ سحر کے ساتھ

جس دل نے مہر و ماہ کو مایوس کر دیا
روشن ہُوا تو ایک شعاعِ نظر کے ساتھ

کھو کر تری تلاش میں مُرجھا چلے تھے ہم
کیا کِھل گئے ہیں آج خود اپنی خبر کے ساتھ

شہرت سکوں تو پھر بھی مُیسّر نہ ہو سکا
ہر چند واسطہ نہ رکھا خیر و شر کے ساتھ

بزم سنواروں غزلیں گاؤں

جینے کے انداز بناؤں

ہردم رُو رُو خون کے آنسو

کیوں آنکھوں کی آب گنواؤں

کب تک دل کے بہکانے پر

تارے گن گن رین بتاؤں

اُن کو میرا دھیان نہیں ہے

میں کیوں اپنی جان گنواؤں

میرا غم کس نے کھایا ہے

میں کیوں دنیا کا غم کھاؤں

سب سے ترکِ تعلق کر لوں

خود سے رسم و راہ بڑھاؤں

مرنے والوں کو مرنے دوں

جلنے والوں کو اپناؤں

ہر میّت کے سرہانے شہرت

نغمے چھیڑوں جشن مناؤں

آؤ کہ ابھی چھاؤں ستاروں کی گھنی ہے
پھر شام تلک دشتِ غریب الوطنی ہے

کچھ بھی ہو مگر حسن کی فطرت میں ابھی تک
پابندیٔ رسم و رہِ خاطر شکنی ہے

مت پوچھ کہ کیا رنگ ہے ضبطِ غمِ دل میں
ہر اشک جو پیتا ہوں وہ ہیرے کی کنی ہے

شاعر کے تخیّل سے چراغوں کی لووں تک

ہر چیز تری بزم میں تصویر بنی ہے

تم جس کو بہت سمجھے تو اک بوند لہو کی

پوچھو مرے دامن سے عقیق یمنی ہے

معلوم ہوا جب کہ رہا کچھ بھی نہ دل میں

بس ایک نظر قیمتِ دنیائے دنی ہے

خسرو کا تجمّل ہے نہ شیریں کا تغافل

فرہاد کی قسمت میں وہی کوہ کنی ہے

ابلیس ہو سقراط ہو سرمد ہو کہ منصور

خود آگہی ہر حال میں گردن زدنی ہے

مقصود نہ بلبل ہے نہ طوطی ہے نہ قمری
مطلب تو چمن والوں کا ناوک فگنی ہے

آسائش گیتی ہے سزا بے ہنری کی
آزردگیٔ دل صلۂ خوش سخنی ہے

کن پھول فضاؤں کی توقع میں پڑے ہو
ہشیار! کہ یاں ذوقِ صبا شعلہ زنی ہے

آؤ چلیں اِس انجمنِ بوالہوساں سے
آتش نفسی ہے نہ جہاں گل بدنی ہے

شہرت سے کبھی جان طلب کر کے تو دیکھو
ہر چند تہی دست ہے پر دل کا غنی ہے

فضا میں بس گئی پھر ایک خوشبو

بجز دل ہر طرف ہے عالمِ ہُو

پھر اُن شاخوں پہ کلیاں مسکرائیں

جنہیں سنولا گئی تھی یاس کی لُو

بگولے گرد بن کر اُڑ گئے ہیں

بہاریں ناچتی پھرتی ہیں ہر سو

فسانہ بن گئے نورِ سحر ہیں،
ستارے، چاند، آنسو، شمع، جگنو
یہ پارہ تھا کہ شعلہ تھا کہ بجلی!
اُنھیں پایا تو پایا دل پہ قابو
نظر جھکنے کو دل جلنے کو بے کل
کوئی محرابِ لب یا طاقِ ابرو
فسونِ زندگی، خوابِ پریشاں،
ترے غم نے جگائے ہیں وہ جادو
یہ گھڑیاں عمر کا حاصل ہیں شہرت
بھرے آتے ہیں کیوں آنکھوں میں آنسو

تھی کبھی جن کے لئے بزمِ دل و جاں ہم سے

آج وہ لوگ بھی رہتے ہیں گریزاں ہم سے

سالہا سال کی جس طرح شناسائی کا

اس طرح بڑھ کے ملے اہلِ بیاباں ہم سے

فق ہوا جاتا ہے کیوں رنگ چمن والوں کا

سینکڑوں ہو گئے ابھی اور غزل خواں ہم سے

وہی غارت گرِ ہر شے ہیں انہیں کون کہے

پوچھنے والے حدیثِ سروساماں ہم سے

جس طرف دیکھتے ہیں دیکھتے رہ جاتے ہیں

اِس زمانے میں کہاں پاؤ گے حیراں ہم سے

اپنے ہی دل کی فضاؤں میں سکوں ڈھونڈ لیا

اور دیکھا نہ گیا حالِ پریشاں ہم سے

آج پلکوں پہ جھمکتا نہیں اک بوند لہو

آج تو بھی ہے خفا اے غمِ جاناں ہم سے!

ہم وہ دریائے تماشا ہیں کہ باوصفِ وصال

صورتِ موج وہ رہتے ہیں گریزاں ہم سے

نکہت و نور کو نغمے کی لپک دی شہرت

مہک اُٹھا نفسِ شہرِ نگاراں ہم سے

وہ دن اک داستاں ہے جن کا پل پل
تصوّر کی نظر سے بھی ہیں اوجھل
ڈھلک جاتے ہیں گُل بوٹوں کے منکے
بنا دیکھے گزر جاتے ہیں بادل
کسی کی روح کا بُجھتا ہے شعلہ
کسی کی آنکھ میں جلتا ہے کاجل

کسی کے دھیان پر پہرے لگے ہیں
کسی کے پاؤں میں بجتی ہے چھاگل!
ترے غم کو بھی لے ڈوبے نہ اک دن
سوادِ دل میں سنّاٹوں کا جل تھل
نہ آئی لوٹ کر تو کیا کروں گا!
مجھے بھی اے شبِ غم ساتھ لے چل
ملیں گے ان گنت جی کھونے والے
نہ پاؤ گے مگر شہرت سا پاگل

○

عشق ہے اب تک تن من دھن

مٹتے مٹے گی رسمِ کہن

دل میں ہے آج بھی اُس کی لگن

دھکا ہوا سیّال بدن،

لعلِ یمن، آہوئے ختن

نورِ جبیں، خوشبوئے دہن

ماہِ دو ہفتہ، نجمِ سحر
عارضِ تاباں، خالِ ذقن
شمع کی لَو، بجلی کی جھمک
لب کی لپک، دانتوں کی چھبن
چشمِ غزال، ابروئے دودم
شعرِ نظیری، بیتِ حسن
بات کا ڈھب، لفظوں کی کھنک
روحِ ترنم، جانِ سخن،
وہ مرے عرضِ مطلب پر
دل میں ہنسی، ماتھے پہ شکن

چہرے پہ فرطِ حیا سے عرق
تاروں سے جیسے سجا ہو گگن
لیکن صحنِ تصوّر میں،
جیسے سحر کی پہلی کرن
جیسے نویدِ شامِ وصال
جیسے اُمیدِ صبحِ وطن،
محو ہے اُس کی آہٹ میں
آج بھی دل کی ہر دھڑکن
اہلِ جنوں کے دامن میں،
گُل سے سوا ہیں خارِ چمن

زادِ سفر بھی منزل بھی
ایک تصوّر، ایک لگن،
کون سُکھی ہے چھان مرے
مسجد، مندر، بستی، بن،
ہار نہ دیں جی دکھیا رے
پاؤں میں چھالے، راہ کٹھن
دھوپ کہیں تو چھاؤں کہیں
گھوم رہا ہے چرخِ کہن
پھر وہی میرِ مجلس ہیں
شہرت یہ کیا پاگل پن

شہرتؔ اُٹھو کہ داغِ وفا دھو چکے بہت
اِس نعشِ بے کفن پہ لہو رو چکے بہت

کلیوں کی سوندھی سوندھی مہک کہہ رہی ہے کیا
کانٹے خود اپنی راہ میں تم بو چکے بہت

یہ وہ سفر ہے جس میں ہر اک ذرہ مہر ہے
تاروں کی ٹھنڈی چھاؤں تلے سو چکے بہت

دل کے سوا کچھ اور بھی منظر ہیں دیدنی
تابانیٔ خیال و نظر کھو چکے بہت

صحرا کی دوپہر پہ شبِ گلستاں نثار

یعنی خرابِ زلفِ پریشاں ہو چکے بہت

اب چار دن وصال کی بھی گفتگو رہے

افسانہ ہائے ہجر بیاں ہو چکے بہت

سر پر غبارِ دشتِ غریبی سجایئے

جاں بہرِ مرغزارِ وطن کھو چکے بہت

ہاں نشترِ فسردہ دلی میں بھی بات ہے

ہاں خواہشوں کے زخم رفو ہو چکے بہت

شہرت ان آندھیوں میں اکھڑ جائیں گے پہاڑ

جینے کا یہ قرینہ نہیں سو چکے بہت

رہا نہ زنجیرِ پا منزل بہ منزل
غمِ دنیا، غمِ عقبےٰ، غمِ دل
کوئی سورج، کوئی تارہ، کوئی چاند
کہ یہ شمعیں نہیں شایانِ محفل
خود اپنی جستجو میں کھو گئے ہم
نظر آئے نہ جب آثارِ منزل

اجل کے آرزو مندو! وہاں تو
کچھ اس سے بھی کڑے ہوں گے مراحل
وہی طوفاں بہ رنگِ نو ہے درپیش
نہ راس آئی ہمیں آغوشِ ساحل
زباں پر لاکھ نغمے رسمسائے
فضا میں ہے وہی شورِ سلاسل
کریں کس سے گلہ غارتگری کا
کہ ہم خود بھی ہیں ان لوگوں میں شامل
بایں محویتِ آلامِ ہستی
ترا شہرت رہا تجھ سے نہ غافل

اے غم اک ایسا وار نہ پھر دل سنبھل سکے
شاید کوئی وصال کی صورت نکل سکے

جلتے رہے ہزار ترے غم کی آنچ میں
لیکن تمام عمر نہ پہلو بدل سکے

کیا کیا امیدیں لے کے روانہ ہوئے تھے ہم
تم دو قدم بھی ساتھ ہمارے نہ چل سکے

ہم ایسے ٹمٹماتے دیوں کی بساط کیا
ان آندھیوں میں چاند ستارے نہ جل سکے

اِک نعمتِ عجیب ہے غمِ روزگار بھی
لیکن جو تیرے درد کے سانچے میں ڈھل سکے

کیا رات ہے کہ چاند ستارے بھی جل بجھے
شہرتؔ کوئی غزل کہ طبیعت بہل سکے

○

سانحے اب تو مسلسل ہو گئے

بس غمِ دوراں کہ ہم شل ہو گئے

کیسی کیسی محفلیں برہم ہوئیں

کیسے کیسے لوگ اوجھل ہو گئے

اس طرح دنیا زوال آمادہ ہے

گویا سب نقشے مکمل ہو گئے

اُن کا جانا تھا کہ دل یوں سو گیا
جیسے اک عُقدہ تھے ہم — حل ہو گئے
جب کسی اُمید نے چھیڑی غزل
دل زدے کچھ اور بے کل ہو گئے
ایک شہرت کیا کہ شہرِ شوق میں
کتنے سادہ لوح پاگل ہو گئے

○

اُن کو بھی ہے کچھ نہ کچھ لگاؤ

تا زیست یہی فریب کھاؤ

پھر غل ہوا پھوٹتی کرن کا

مایوس شگوفو مسکراؤ

کیوں جی کو نڈھال کر رہے ہو

اشکوں سے کہیں بھرے ہیں گھاؤ

جاگی ہوئی محفلیں سُلا دو

سوئے ہوئے راستے جگاؤ

مٹتے رہیں زندگی کے خاکے

رِستے رہیں خواہشوں کے گھاؤ

آلام جہاں میں گھر گیا ہوں

اے بھولنے والو یاد آؤ

آنسو کو ترس گئی ہیں پلکیں

اے چاند ستارو ڈوب جاؤ

جب تک وہ بلائیں یا خود آئیں

شہرت کوئی داستاں سُناؤ

آنسو ڈھلک کے گوشۂ داماں میں آ رہے
آبادیوں کے لوگ بیاباں میں آ رہے

سیکھا تھا جن سے دشت نے آبادیوں کا نام
فتنے وہ رفتہ رفتہ گلستاں میں آ رہے

ظاہر ہوئے کبھی نہ غبارِ نقاب سے
آئینہ بن کے دیدۂ حیراں میں آ رہے

آنکھیں جھلس کے رہ گئیں منظر بھڑک اُٹھے
انگارے سے یہ کیا خسِ مژگاں میں آ رہے

جلتی ہے ورنہ کب تنِ تنہا سحر تلک
دل تھے جو شمعِ گورِ غریباں میں آ رہے ہے

یوں سو گئے ہیں جیسے نہ جاگیں اب کبھی
جو لوگ سایۂ غمِ جاناں میں آ رہے ہے

یہ کیا کیا خیال کے قصرِ بلند سے
دل کی سرائے بے سروساماں میں آ رہے ہے

آغوش سے بھی جن کو رہا رم تمام عمر
انجامِ کار خوابِ پریشاں میں آ رہے ہے

شہرتؔ وہ دن نصیب ہو کب کیا خبر کہ جب
سارے بدن کا زہر رگِ جاں میں آ رہے ہے

کہیں کس سے، کوئی سنتا ہے یارو
کھلونا جانتے ہیں لوگ دل کو

ہمیشہ چاند میں گم رہنے والو
کبھی ٹوٹا ہُوا تارا بھی دیکھو
ہمیں بھی کان بخشے ہیں خدا نے
کبھی ہم سے بھی کوئی بات کر لو
سمندر سے کبھی فرصت جو مل جائے
کوئی دم آ کے صحرا پر بھی برسو

گزر جاتے ہو یوں دامن بچا کر
کہ جیسے خاک کی ڈھیری پڑی ہو
رواں ہو جیسے کوئی ابر پارہ
ہمارے پاس بھی کچھ دیر ٹھہرو
پریشاں پھر رہے ہیں کو بکو ہم
ہمیں بھی زندگی کرنا سکھا دو
نہ ہم گل ہیں نہ گل کی آبرو ہیں
غنیمت ہے جو خار و خس ہی جانو
کہا کس نے کہ ہم برگِ حنا ہیں
بسانِ سبزۂ بیگانہ روندو

یہ شمعیں پھر کبھی روشن نہ ہونگی
ٹھہر جاؤ صبا کے نرم جھونکو

سناتے ہو کسے شہرت بخاری
جسے اپنی خبر بھی نام کی ہو
اِسی ماحول کا حصّہ ہے وہ بھی
اُسے کچھ ماورا اِس سے نہ جانو
اِسی بت خانے کا پیکر ہے وہ بھی
فضائے کعبہ کا طائر نہ سمجھو

یہاں احساس کے سائے ہیں عنقا
گنواتے ہو کہاں آنکھوں کو رو رو
یہ پُتلی کا تماشا ہو رہا ہے
یہاں صاحب نظر کیا ڈھونڈتے ہو
ق
رہو برسوں اگر سانسوں کی گرمی
دلوں کی دھڑکنوں کے ساتھ دھڑکو
لہو بن کر پھرو اِن کی رگوں میں
یہ پھر بھی غیر ہی سمجھیں گے تم کو
تمہارے درد کا درماں نہیں ہے
غزل کے بحرِ بے پایاں میں ڈوبو

آج پھر سانس رُکی جاتی ہے
روشنی دُور ہوئی جاتی ہے
جس زباں پر تھے فسانے لاکھوں
بات کرنے سے رہی جاتی ہے
اب اندھیرے بھی نہ پاؤ گے یہاں
اب کے وہ شمع بجھی جاتی ہے

ضبطِ غم تو کوئی دشوار نہیں
اُن کی آنکھوں کی ہنسی جاتی ہے
کیوں شفق پھیل گئی چہرے پر
بات کہنے کی کہی جاتی ہے
زندگی ایک محل تھا شہرت
راکھ کا ڈھیر ہوئی جاتی ہے

○

ہم بھی رکھتے ہیں زادِ راہِ عدم
اپنا غم، تیرا غم، جہان کا غم

نہ کھلا رونقِ چمن کیا ہے
خندۂ گل کہ گریۂ شبنم!

تیرے پہلو میں، تجھ سے کوسوں دور
دل ہمیشہ رہا رہینِ ستم

ہم سے پہلے بھی باغِ ہستی میں
پھول کھلتے رہے مگر کم کم

ہو گئے نذرِ گردشِ دوراں

حسن کے ناز، عشق کے دم خم

اب نہ وہ صحبتیں نہ وہ جلسے

ایک عالم ہے وقفِ صد ماتم

منتہیِ آدمی سے بس نہیں

گوشہ دیر ہو کہ صحنِ حرم

حاصلِ دشت . . مرگِ تشنہ لبی

کس توقع پہ جی رہے ہیں ہم

جب تلک دل جواں رہا شہرت

ساتھ اپنے رہا ہے ایک عالم

عبث جان دیتے ہیں الیسوں پہ ہم
جنہیں دھیان رہتا ہے اپنا بھی کم
وہ انسان ہو کر ہیں پتھر کے بُت
کہ ذوقِ کرم ہے نہ شوقِ ستم
قدم گھر سے باہر نہ نکلا کبھی
مگر اُن کی خو میں ہے آہو کا رم
اُنہیں رام کرنے میں ناکام ہاں
اُلجھتے نفس، ڈگمگاتے قدم

وہاں حشر فریاد بھی بے اثر
یہاں ہر سخن پر نکلتا ہے دم
ہوئی جتنی راہِ تجسس تمام
سوا ہو گئے راہ کے پیچ و خم
پرافشاں ہوئیں اس طرح آندھیاں
کہ گل ہو گئی شمعِ دیر و حرم
یہ کس دیس میں آ رُکے قافلے
جہاں شامِ ہستی نہ صبحِ عدم
بہت اِدّعائے وفا تھا تمہیں
مگر کھل گیا آج شہرت بھرم

دنیا کے ازل سے یہی عنوان رہے ہیں
اک خاکِ بیاباں ہے کہ ہم چھان رہے ہیں
اب سوزشِ پیہم کے سوا کچھ بھی نہیں ہے
کیا کیا نہ مرے سینے میں ارمان رہے ہیں
دنیا ہمہ حیرت ہمہ ظلمت ہمہ حسرت
ناچار ترے قدموں میں پھر آن رہے ہیں

بجلی میں، ستاروں میں، شراروں میں، گلوں میں
دیکھا ہے کہیں آپ کو پہچان رہے ہیں

حائل نہ رہیں نور کی کرنیں بھی مگر ہم
اک دوسرے کے واسطے انجان رہے ہیں

سنسان در و بام، پریشاں دھندلکے
یہ بستیاں وہ ہیں جہاں انسان رہے ہیں

دو غزلوں پہ کیا فخر کرے کوئی کہ شہرت
پیشِ نظر استادوں کے دیوان رہے ہیں

○

ہر ایک نقش سے گزرو خلا میں رنگ بھرو

فسانہ کہتے رہو پر کسی کا نام نہ لو

لبانِ غنچہ پہ ہر دوپہر کا کھلنا کیا

تھمیں نہ پھر کبھی آنسو ہنسو تو اتنا ہنسو

یہ بے کلی یہ تذبذب یہ کشمکش کب تک

کسی کو اپنا بنا لو، کسی کے بن کے رہو

اکیلا چاند بھی نظروں پہ بار ہوتا ہے
کسی کی آنکھ میں جھمکو، کسی کے دل میں چبھو

کہیں تو سانس اُکھڑ جائے گی شبِ غم کی
چراغِ آہ جلاؤ، صبا کی آس بنو

کبھی تو جلوۂ منزل نظر سے کھیلے گا
غبارِ قافلۂ دل کے ساتھ ساتھ چلو

غزل کہو کہ محبت کرو مگر شہرت
زمانہ بھول نہ جائے تمہیں وہ کام کرو

○

آتشِ عشق بہ ہر سیلِ محن رہتی ہے

لاکھ پردے ہوں مگر جلوہ فگن رہتی ہے

سعئ اخفائے محبت میں زیاں ہے جی کا

بوئے گل بھی کہیں پابندِ چمن رہتی ہے!

دل کا بجھنا ہے قیامت کا بپا ہو جانا

چاند میں نور نہ پھولوں میں پھبن رہتی ہے

ہم سے آشفتہ مزاجوں کو محبت سے غرض
یونہی اک چھیڑ سی اے غنچہ دہن رہتی ہے!
راستہ عشق کی منزل کا ہے دو چار قدم
سالہا سال مگر اس کی تھکن رہتی ہے
وقت ہر زخم کو ہر گھاؤ کو بھر دیتا ہے
عمر بھر دل میں مگر ایک چبھن رہتی ہے
ہر رگ و پے میں ہے ساری غمِ دوراں شہرت
ایسے عالم میں کسے تابِ سخن رہتی ہے

○

تم ہٹ نہ سکے پیرویٔ چرخ کہن سے
ہم آج بھی زندہ ہیں تو کچھ اپنے چلن سے
کیا گردشِ ایام ہے، جلتے ہیں ابھی تک
جو لوگ تڑپ جاتے تھے ماتھے کی شکن سے
اب کون ترے گیسوئے خم دار سنوارے
یہ دور تو واقف ہی نہیں دار و رسن سے

کہتے ہوئے کچھ منہ سے حیا آتی ہے ورنہ
اپنا بھی تعلق تھا کبھی سرو و سمن سے
جن نغمہ سراؤں نے بہاروں کو جگایا
سنسان ہیں بے مہریٔ اربابِ چمن سے
شبنم ہمہ شب اشک بہاتی رہی لیکن
کلیوں میں ہنسی پھیل گئی ایک کرن سے
غربت میں تو صد رقصِ جناں سے بھی سوا ہے
وہ ایک بگولا کہ اٹھے ریگِ وطن سے
اترے ہوئے چہرے سے ترے پا گئے شہرت
وہ راز کہ افشا نہ ہوا تیرے سخن سے

اپنی بساط کیا تھی جو منزل کی سوچتے

اِس راستے میں ہار گئے جی بڑے بڑے

کیا کچھ نہ بیت جائے جو صحرا سے لوٹیے

پھلواریوں سے آئے ہیں کانٹے لئے ہوئے

پائیں کسی کے دل میں جگہ ہم بقدرِ خس

اِن کوششوں میں اپنے بھی دل سے اُتر گئے

جب تک بن آئی ساتھ دیا ہے چراغِ دل
تو جان اور یہ آندھیاں جانیں کہ ہم چلے

تاروں سے کیا گلہ کہ شبِ غم ہے وہ بلا
رہنے لگے ہیں اپنے بھی سائے پرے پرے

دھیان آ گیا تو چہرے پہ جگنو دمک اٹھیں
ورنہ ہمیشہ دل میں اندھیرے بسے رہے

شہرت وہ لوگ بھی نہ رہے اپنے ہمنوا
اک عمر جن کی یاد میں غزلیں کہا کئے

○

وہ کیا اثر ہے کہ جو میری داستاں میں نہیں
بقدرِ راز مگر ضبطِ رازداں میں نہیں

فسردہ ہونے سے حاصل؟ چلو تلاش کریں
کہیں تو ہونگی بہاریں جو گلستاں میں نہیں

نگاہِ شوق ہی سب کچھ ہے حسن کیا شے ہے
وہ دل کشی کہ ہے عنواں میں داستاں میں نہیں

رہائی پا کے بھی نظریں لگی ہیں سوئے قفس
کوئی تو بات ہے ایسی کہ آشیاں میں نہیں
پہنچ کے منزلِ مقصود پر یہ راز کھلا
کہ جس کو ڈھونڈ رہا ہوں وہ دو جہاں میں نہیں
قفس سے چھوٹ بھی جاؤں تو جی لگے گا کہاں
کہ اپنے وقت کا تنکا بھی گلستاں میں نہیں
زمانہ پہرے کی رنگت سے بھانپ لیتا ہے
وہ ذکرِ خاص کہ شہرت ترے بیاں میں نہیں

کیوں اپنی خاک ہی نہ ہوا میں اُڑائیے

تا چند دل کے مرثیے کہہ کہہ سُنائیے

تصویر بن گئے ہیں وہ کیوں جن کی ریت تھی

کانٹا بھی مسکرائے تو دھومیں مچائیے

اپنے سوا کچھ اور دکھائی نہ دے سکا

مدت سے آرزو تھی کہ پردہ اُٹھائیے

جن کے خمیر ہی میں تغافل ہو اُن کو کیا
سینے کے داغ چھوڑ کے سورج دکھائیے

یہ تو گلہ نہ ہوگا کہ اپنا نہیں کوئی
جی چاہتا ہے چل کے بیاباں بسائیے

کیوں مُضمحل ہوں جب یہ زمانے کی رسم ہے
دو چار دن ہنسائیے برسوں رُلائیے

تا آپ پر کھُلے کہ میں زندہ ہوں کس طرح
فرصت ملے تو میری غزل گنگنائیے

شہرتؔ تمام رات یہی کشمکش رہی
کس شمع کو بجھائیے کس کو جلائیے

بہار آ کے رہے گی نہیں جو آج تو کل
یہ ریگزار ہے لیکن یہیں کھلیں گے کنول
سمجھتے ہم بھی ہیں پر دل کو کون سمجھائے
نمودِ صبح مسلّم ہے اور موت اٹل
یہاں تو جی سے گزرنا ہے سانس بھی لینا
کہاں کی انجمن آرائیاں کہاں کی غزل

روش روش پہ بگولے شجر شجر سے دھواں
دہائی اے غم دوراں! مجھے کہیں لے چل
ہر ایک ذرّے سے نے بڑھ بڑھ کے ہاتھ پھیلائے
مگر نگاہ بچا کر نکل گئے بادل
بٹھائے آس کے پہرے بہت مگر شہرت
غموں نے لوٹ لیے خواہشوں کے رنگ محل

○

آس کی شمع بجھی چاند ستارے ڈوبے

ڈوبنے والوں کے ہمراہ کنارے ڈوبے

ہم تو ساحل سے جُدا ہوتے ہی دم توڑ گئے

ہائے وہ لوگ جو ہمت نہیں ہارے ڈوبے

نقشِ ہستی میں نئے رنگ اُبھرتے دیکھے

جب ترے دھیان میں ہم پیار کے مارے ڈوبے

کان پتھر تھے وہاں، ہونٹ یہاں برف ہوئے
کوئی سمجھائے۔ کسے، کون پکارے "ڈوبے"

ذرّے ذرّے سے مئہ چار دہم پیدا تھا
آنکھ جھپکی کہ نظر ڈوبی، نظارے ڈوبے

کس توقع پہ کوئی سیلِ حوادث سے بھڑے
جس پہ تکیہ تھا اُسی دل کے سہارے ڈوبے

کب تلک شمع کی مانند گھلو گے شہرت
آؤ کچھ دیر کو سو لیں کہ ستارے ڈوبے

مر مر گئے انتظار کرتے
پھر کیا ترے بے قرار کرتے
ہر لب پہ وفا کے گیت روشن
کس کس کا نہ اعتبار کرتے
حالات کی رو میں بہہ گئے ہم
حالات کو سازگار کرتے

آخر کو خود اپنے ہو گئے ہم
کب تک ترا انتظار کرتے

منزل کا خیال خواب شہرت
جو راہ بھی اختیار کرتے

○

کانٹوں سے دل لگاؤ کہ تا عمر ساتھ دیں
پھولوں کا کیا جو سانس کی گرمی نہ سہہ سکیں
کھو جائیں کاش اِس طرح وحشتِ خیال میں
ڈھونڈے سے پا سکے نہ کوئی آرزو ہمیں
جُز خارِ خستہ حال کہ تلووں میں رہ گئے
کوئی بھی ہمسفر نہ مِلا راہِ عشق میں

ہیں سینہ چاک رووٗں چمن میں بہار ہو!
ممکن نہیں کہ تم نہ ہنسو اور گل ہنسیں

دل ہی اُجڑ گیا تو ہمیں اس سے کیا غرض
جنگل بسیں، پہاڑ بسیں، وادیاں بسیں

لاہور اب نہیں ہے بجُز مشہد سکوں
شہرتؔ چلو مدینے چلیں، کربلا چلیں

○

رکھتا ہوں گواہ بام و در کو
جھپکی نہیں آنکھ لمحہ بھر کو
افسانے ترے سُنا سُنا کر
بہلایا ہے عمرِ مختصر کو
یوں تم نے بھلا دیا کہ اب تک
یاد آئے نہ مرگِ حیلہ گر کو

تم ہنس بھی سکے نہ میرے غم پر
ایسا بھی غرور کیا بشر کو

منزل پہ پہنچ کے رو رہا ہوں
کاٹا تھا ہنسی خوشی سفر کو

جھلسا دیا ایک ہی کرن نے
سبزے کو، پھول کو، شجر کو

ہر شاخ پہ رقصِ شعلہ ہو گا
اک موجِ ہوا ہے بس شرر کو

تصویر سا تک رہا ہوں شہرتؔ
خاموش، اداس رہگزر کو

وہ آئیں نہ آئیں خواب اُن کے
یہ شام و سحر بھی دیکھنا تھے
شمعیں ہیں مگر اُڑی اُڑی سی
تارے ہیں مگر لُٹے لُٹے سے
راہی ہے نہ راہبر نہ رہزن
سنسان پڑے ہوئے ہیں رستے

خواہش ہو کہ آس ہو کہ آنسو
پہلو میں کوئی تو چیز کھٹکے
منزل کا نشاں بھی دے تو حاصل
جس راہ میں پھول ہوں نہ کانٹے
شایانِ چمن نہیں خموشی
بجلی ہی گرے، کلی نہ چٹکے
شل ہو گئی گردشِ زمانہ
برسوں میں گزر رہے ہیں لمحے

جیتے ہیں اُنہی کے نام پر ہم
اک عمر ہوئی ہے جن کو دیکھے

کیا گھُن تمہیں کھا رہا ہے شہرت
کچھ منہ سے کہو تو کوئی سمجھے

○

ہستی کی نہ موت کی طلب ہے
یہ صورتِ حال بھی عجب ہے
خود اپنے سے لو لگائیں، آؤ
ہر قدر یہاں کی جاں بلب ہے
پہلے بھی قیامتیں تھیں لیکن
یہ حال کبھی نہ تھا جو اب ہے

تکلیفِ شکستِ دل، فسانہ
احساسِ شکستِ دل غضب ہے
پیغامِ فسردگی ہے دل کو
وہ نغمہ کہ مائلِ طرب ہے
ہر چند ہے جانگسل شبِ غم
لیکن شبِ وصل بھی غضب ہے
کہنے کو ہزار اہلِ دل ہیں،
شہرت کا مگر جواب کب ہے

○

کچھ بھی ہو مگر پاؤں کی زنجیر نہیں ہے
وہ دل کہ جسے حسرتِ تعمیر نہیں ہے
اپنے ہی قدم اپنا ہی سر اپنے ہی سجدے
اب دل میں کسی اور کی تصویر نہیں ہے
آنسو ہیں نہ تارے ہیں نہ شمعیں ہیں نہ جگنو
یارب یہ مرے خواب کی تعبیر نہیں ہے

ہر لفظ میں شہرت ہے مسیحائی کا اعجاز

کافر ہے کہ جو معتقدِ میر نہیں ہے

○

ہوں پائمالِ حوادث مگر اُداس نہیں
ہیں وہ نہیں جسے آدابِ غم کا پاس نہیں
تری نظر کے تقاضائے عرضِ غم پہ نثار
مگر یہ دل کہ جسے ذوقِ التماس نہیں
تمام عمر بسر کی ہے ایسے پھولوں میں
کہ جن کے سایۂ رنگ آفریں میں باس نہیں

قدم قدم پہ گماں ہے نئی بہاروں کا
جہاں میں مجھ سا کوئی کشتۂ قیاس نہیں

ترے وصال کی حسرت کروں تو کس دل سے
ابھی تو مجھ کو تری آرزو بھی راس نہیں

تسلّیوں سے تو بہلا رہے ہیں اہلِ خبر
مگر علاجِ غمِ دل کسی کے پاس نہیں

اسے بھی اپنی محبت کا معجزہ ہی سمجھ
کہ آج بھی ترا شہرت رہینِ یاس نہیں

جاتے ہوئے ہر گل سے کہا بادِ صبا نے
خاموش! کہ آتی ہے خزاں خاک اُڑانے
اب پیشِ نظر ہے کوئی امروز نہ فردا
اِس آس میں بیٹھے ہیں کہ پلٹیں گے زمانے
دنیا کو گزرنا ہے گزرتی ہی رہے گی
وہ یاد پُرانی ہے نہ یہ خواب پُرانے

ہر غم مجھے منظور ہے، ہر ظلم گوارا

جب تک ترے غم سے ہیں مرے خواب سہانے

کیوں ذکر کسی کا رہے، کیوں فکر کسی کی

جینا ہے تو جینے کے لئے لاکھ بہانے

وہ ملتے ہیں اُن کو جنہیں تقدیر ملائے

کہہ دے کوئی شہرت سے یونہی خاک نہ چھانے

روٹھنے والے یہ دل پیار کے قابل تھا سو ہے
شمعِ کشتہ ہے مگر درخورِ محفل تھا سو ہے

دشت آباد ہوئے کوچۂ لیلیٰ ویراں
قیس حسرت کشِ نظّارۂ محمل تھا سو ہے

کیسے کیسے مہ و خورشید اُفق پر اُبھرے
وہ اندھیرا کہ محیطِ نگہ و دل تھا سو ہے

آسمانوں کی، زمینوں کی خبر لے آئے
خود کو پانا مگر اپنے لئے مشکل تھا سو ہے

رات دن زہر پلایا غمِ دوراں نے مگر..
غمِ جاناں کہ مرے خون میں شامل تھا سو ہے

آپ ہی ایسے گئے لوٹ کے پھر آ نہ سکے
ورنہ شہرتؔ غمِ کونین سے غافل تھا سو ہے

○

عمر بھر دل کو اِس احساس نے بخشی تسکیں

کہاں وہ چاند ستارے، کہاں ہم خاک نشیں

اب کے اُمید کی شمعیں بھی دھواں دے اُٹھیں

بستیاں ورنہ یہ سو بار لُٹیں اور بسیں

بجلیاں راکھ ہوئیں، شُعلے سیہ پوش ہوئے

تم نے شمعیں جو بجھائیں کسی عنواں نہ جلیں

آج رہ رہ کے جو یوں اپنا خیال آتا ہے
تم مجھے بھول گئے ہو کہیں ایسا تو نہیں؟

کس نے محرومیٔ شبنم کا فسانہ چھیڑا
عرق آلود ہوئی جاتی ہے پھولوں کی جبیں

تیری صورت بھی نگاہوں سے چھپی جاتی ہے
لے اُڑا آج ترا دھیان مجھے دور کہیں

اُنہی دو باتوں سے افسانے بنے ہیں کیا کیا
جو تمہیں بھول گئیں اور مجھے یاد رہیں

یہ بھی اعجازِ نسیمِ سحری ہے شہرت
باغ شاداب نظر آتے ہیں کلیاں غمگیں

جن کی آنکھوں میں وہ بس جاتے ہیں
اپنی صورت کو ترس جاتے ہیں
دل زدوں کا بھی گزر مشکل تھا
اب جہاں اہلِ ہوس جاتے ہیں
ہائے وہ پھول کہ با وصفِ صبا
صبح سے پہلے بکس جاتے ہیں

خواب ہو جائیں گے کیا ہم کیا شمع

اور دو چار نفس جاتے ہیں

نازکی اہلِ خبر کی مت پوچھ

موجۂ گل سے جھُلس جاتے ہیں

دمِ عیسیٰ بھی نہیں اُن کا علاج

اپنے سائے جنہیں ڈس جاتے ہیں

دشت پھیلاتا ہے دامانِ طلب

ابر دریا پہ برس جاتے ہیں

وہ تو وہ خود سے بھی اکثر شہرت

بات کرنے کو ترس جاتے ہیں

لمحے صدیوں میں بدل جاتے ہیں، وہ کیا جانیں
باغ سانسوں سے بھی جل جاتے ہیں، وہ کیا جانیں
کوئی تو بات ہے جس کے لئے ہم خود سے بھی
منزلوں دور نکل جاتے ہیں، وہ کیا جانیں
ہم کہ پھولوں سے بھی رم کرتے رہے ہیں ہر دم
آج کانٹے سے بہل جاتے ہیں، وہ کیا جانیں

برف کے ایسے بھی تودے کہ ہنسیں دوزخ پر
شمع کی لو سے پگھل جاتے ہیں، وہ کیا جانیں
ہم کو معلوم ہے انجامِ تماشا شہرت
چاند کے روپ بدل جاتے ہیں، وہ کیا جانیں

○

تمہارے فسانوں سے لبریز دل کی ہر دھڑکن
مگر یہ ہونٹ کہ جن میں رہی نہ تابِ سخن
کہاں کے ماہ و کواکب کہاں کے سرو و سمن
چراغِ یاس بہ ہر طاقِ آرزو روشن
اُلجھ سکے نہ جو آگاہِ قیمتِ دل تھے
وہ اپنی زلف میں ڈالا کئے شکن پہ شکن

نقاب کون اُٹھائے اب اُن کے چہرے سے
کہ خواب ہو گئے جاں دادگانِ دار و رسن

پہنچنے والے بہرحال جا پہنچتے ہیں
ہزار آبلہ پائی ہو، لاکھ راہ کٹھن

ترا خیال بھی کچھ سودمند ہو نہ سکا
اُسی طرح ہے ابھی زخمِ زندگی میں دکھن

سفید ہونے کو آئے ہیں موئے سر شہرت
مگر گیا نہ طبیعت سے آپ کی بچپن!

○

وہ پاس آئے، آس بنے اور پلٹ گئے
پردے کئی نگاہ کے آگے سے ہٹ گئے
گمراہیوں کا چسکا کچھ ایسا پڑا کہ ہم
منزل قریب آئی تو رہبر سے کٹ گئے
دل ہار کر کچھ ایسے طبیعت سنبھل گئی
جیسے تمام عمر کے جھگڑے نپٹ گئے

برسوں کے پیاسے دشت نوردوں سے پوچھیے
اُن بادلوں کا پیار جو گِھرتے ہی چھٹ گئے

بس میں رہیں نہ جب غمِ دوراں کی وسعتیں
ہم لوگ اپنے گوشۂ دل میں سمٹ گئے

شہرت انہیں بھلانے کی کوشش جو کی کبھی
دامانِ دل سے سینکڑوں فتنے لپٹ گئے

○

دشت میں ہوں تو سائے بھی ڈھونڈیں

اپنے ہی شہر میں کہاں جائیں

کیسے سنسان ہیں گلی کوچے

جس طرح آدمی یہاں نہ بسیں

ایسے عالم دکھائے ہیں دل نے

سوتے سوتے بھر آئی ہیں آنکھیں

یوں رگ و پے میں ہے تشنج سا
جیسے ہر لحظہ دل کو سانپ ڈسیں
جیسے وہ لوٹ کر بھی آئیں گے
مدتوں یوں کھلی رہیں یا نہیں
جیسے بس اب فسانہ ختم ہوا
بارہا یوں اُلجھ گئیں سانسیں
یاں تمہارا خیال کافی ہے
راہ تکتی ہیں بے زباں راہیں
ہنستا رہتا ہے شام تک سورج
روتی رہتی ہیں صبح تک شمعیں

ہر تمنا عزیز تھی ہم کو

کس پہ آنسو بہائیں، کس پہ ہنسیں

دل تمہارا، دماغ دنیا کا

راہ تکتی ہیں کس کے ساتھ چلیں

تنگیٔ دشت سے ہیں آزردہ

کوئی موجِ ہوا ملے تو کہیں،

آنسوؤں سے لگی نہیں بجھتی،

کوئی دریا ملے تو ڈوب مریں

شمع کیوں رات بھر سلگتی ہے

چاند تارے یہ راز کیا جانیں

کوئی کیا چارہ ساز ہو جب ہم
خود سے بھی دل کی بات کہتے ڈریں

ہے کمالِ سخن یہی شہرت
سو فسانے ہوں اک اشارے میں

○

سارے گمان دل کے لئے بے اثر ہوئے
ہونا نہ چاہتے تھے ہم اُن کے مگر ہوئے

ٹوٹا کوئی ستارہ نہ کوئی دیا بجھا
ہم لوگ اپنی نعش پہ خود نوحہ گر ہوئے

شام فراق اور کسی کا تو ذکر کیا
سائے بھی دو گھڑی نہ مرے ہمسفر ہوئے

وہ خود بھی اپنے آپ سے محرم نہ تھے کبھی
ہم سے ملے تو قبلۂ اہلِ خبر ہوئے

ہم جن کا طاقِ کعبہ میں بھی دم گھٹا رہا
انجامِ کار شمعِ سرِ رہگزر ہوئے

خوابوں میں بھی خیال سے کوسوں پرے رہے
ہم جن کے دیکھنے کو سراپا نظر ہوئے

کچھ تم پہ منحصر نہیں شہرت بفیضِ دل
کیا جانے کتنے لوگ یہاں در بدر ہوئے

ہر سمت رہروؤں کے نشاں در نشاں ملے
منزل ہی جب نہ ہو تو کہاں کارواں ملے
شاید ترے فسانے میں کچھ رنگ بھر سکیں
ہم کو بھی ایک بار جو اذنِ فغاں ملے
کچھ تیرے دل زدے ہی نظر آئے مطمئن
ورنہ سبھی اسیرِ زمان و مکاں ملے

دیوانگی سے کم نہیں اُمیدِ التفات

وہ خواب میں بھی ہم سے بہت سرگراں ملے

اک عمر کے تعلقِ خاطر کے باوجود

اک اجنبی کی طرح ملے ہم جہاں ملے

ڈھونڈے سے اپنے وقت کا تنکا نہ مل سکا

ملنے کو شاخ شاخ نئے آشیاں ملے

خود رفتگی کی منزلیں جب راس آ گئیں

شہرتؔ کو تم ملے بھی تو آخر کہاں ملے'

لغزش بغیر راہِ وفا طے نہ ہو سکے
کوئی ہزار سوچ سمجھ کر قدم رکھے

میں اک چراغِ راہ تھا، میرا تو ذکر کیا
وہ آندھیاں چلیں کہ ستارے بھی جل بجھے

کیا کیا نہ روپ دھار کے آئیں قیامتیں
ہم دیکھتے رہے ہیں مگر آئینہ بنے

خود اپنی آنچ اُٹھی تو چہرہ دمک اُٹھا

ورنہ تمہاری آگ میں ہم عمر بھر جلے

یوں دل سے ہاتھ دھوئے طبیعت سنبھل گئی

گویا تمام ہو گئے سب غم کے مرحلے

آج اپنا دھیان آیا تو جی سن سے رہ گیا

کس کس کی شکل آ گئی آنکھوں کے سامنے

شہرت شبِ فراق ہے جی بھر کے سوئیے

ممکن ہے لوٹ کر نہ کبھی آئیں یہ سمے

دو عالم رہینِ صد ماتم ہوئے ہیں
کہیں گیسو ترے برہم ہوئے ہیں
کچھ ایسی آندھیاں اُٹھّیں کہ دل سے
نقوشِ عشق تک مبہم ہوئے ہیں
غمِ دل سے ہے نامحرم ابھی تک
وہ آبادی کہ جس میں ہم ہوئے ہیں

قریب آیا ہے جتنا مہرِ تاباں
اندھیرے اور بھی محکم ہوئے ہیں
وہی آنسو کہ تھے غارتگرِ دل
علاجِ سوزشِ پیہم ہوئے ہیں
بھرے جنگل میں بس کانٹوں نے سوچا
"کہ کیوں دیوانے آخر کم ہوئے ہیں؟"
کسی دن ایک ہو جائیں گے شہرت
ابھی ہم آشنا کم کم ہوئے ہیں

○

بنا جانے کسی کے ہو گئے ہم
غبارِ کارواں میں کھو گئے ہم
رگوں میں برف سی جمنے لگی ہے
سنبھالو اپنی یادوں کو، گئے ہم
تمہاری مسکراہٹ رچ گئی ہے
ہر اُس غنچے میں جس پر رو گئے ہم

کسے معلوم کیا محفل پہ گزری
فسانہ کہتے کہتے سو گئے ہم

اکیلا راہرو لُوٹا نہ جائے
ترے رستے میں نظریں بو گئے ہم

تری چاہت کے سنّاٹوں سے ڈر کر
ہجومِ زندگی میں کھو گئے ہم

وہ چھالے ہی سہی، اپنے تو ہوں گے
سوئے صحرا روانہ ہو گئے ہم

نہ راس آئی کسی کی چھاؤں شہرت
خود اپنی دھوپ ہی میں سو گئے ہم

میرے پہلو میں بھی آ خواب ہیں آنے والے

شہر کو شہر بنا دشت بسانے والے

مجھ سے گمراہ کا کیا ذکر، وہ طوفاں اُٹھے

راستے بھول گئے راہ دکھانے والے

منزلوں دشتِ تکلّم میں وہ سنّاٹے ہیں

پکڑے جاتے ہیں نظر کو بھی ہلانے والے

میں وہی ہوں مرا دل بھی تری یادیں بھی وہی
جل بجھے اپنے ہی شعلوں میں زمانے والے

ہر بگولے سے پتہ لیتی ہے کانٹوں کی زباں
تم نے دیکھے ہیں مری پیاس بجھانے والے؟

اب اندھیرے بھی جو مل جائیں غنیمت جانیں
خاک کے ذرّوں کو خورشید بنانے والے

شمع بجھنے کو ہے اب تم بھی گھڑی بھر سو لو
لوٹ کر آئے ہیں شہرت کہیں جانے والے!

○

تمہارے غم میں بھی کملا رہے ہیں
چراغوں سے اندھیرے پا رہے ہیں
وہ لُو ہے آج گُل تو پھر بھی گُل تھے
ببولوں کے جگر مُرجھا رہے ہیں
کبھی تو سوچ لو تنہائیوں میں
کہ ہم کیا ہو گئے ہیں، کیا رہے ہیں

اِسی محفل میں جس کی جان تھے ہم

تمہارے واسطے رسوا رہے ہیں

کہاں پھر ہم سے دیوانے ملیں گے

تمہارے درد کو اپنا رہے ہیں

نہ دیکھو گے کبھی — تم سے پھرو گے

وہ تصویریں کہ ہم دکھلا رہے ہیں

جگہ چھلنی ہؤا جاتا ہے شہرت

مگر ہم ہیں کہ غزلیں گا رہے ہیں

○

تو نقاب اُٹھا تجھے اس سے کیا کہ مہیب سیلِ جمال ہے
مجھے اپنے ظرف پہ ناز ہے، تری آبرو کا خیال ہے

نہ وہ تم رہے نہ وہ میں رہا نہ وہ خواب ہے، نہ خیال ہے
مجھے شامِ غم ہی قبول ہے جو یہی سحر کا مآل ہے

وہی کورِ چشم زمانہ ہے، وہی تو ہے تیرا جمال ہے
تجھے آفتاب بنا دیا یہ مری نظر کا کمال ہے

تو ہی سازِ محفلِ خواب ہے، تو ہی شمعِ طاقِ خیال ہے

میں تجھے بھلاؤں تو کس طرح، مری زندگی کا سوال ہے

ترے اک اشارے کی دیر ہے، تری اک نگاہ کی ہے کمی

مری زندگی میں شگفتگی نہ محال تھی نہ محال ہے

نہ رہا جو شہرتِ بے نوا، تجھے کون سمجھے گا پھر خدا

اُسے اپنی زیست کا غم نہیں تری بے کسی کا خیال ہے

○

یاد ہر طرزِ سخن ہے ہم کو
پاسِ آدابِ چمن ہے ہم کو
پاؤں کیا آنکھ اُٹھانا ہے محال
کس قیامت کی تھکن ہے ہم کو
موت جس سے ہے زمانہ خائف
تیرے ماتھے کی شکن ہے ہم کو

کوئی عالم ہو، کوئی محفل ہو،
ایک دُھن، ایک لگن ہے ہم کو
تیرے زخموں کو ہرا رکھتے ہیں
کب سرِ سرو و سمن ہے ہم کو

حالِ دل کیسے بیاں ہو شہرتؔ
سانس لینا بھی کٹھن ہے ہم کو

○

دل کے ہمرہ گیا ہے کیا کیا کچھ
پھر بھی زنجیرِ پا ہے کیا کیا کچھ
اک تبسّم تھا چند آنسو تھے
جن کا چرچا رہا ہے کیا کیا کچھ
وصلِ انجم، فراقِ لالہ و گل
دل گنوا کر ملا ہے کیا کیا کچھ

اہلِ منزل ہنسے تو یاد آیا
راہ میں رہ گیا ہے کیا کیا کچھ

باغِ دنیا سے دشتِ عقبیٰ تک
اک شرر سے جلا ہے کیا کیا کچھ

تم غزل کہہ کے سو رہے شہرتؔ
اُن کو سُننا پڑا ہے کیا کیا کچھ

○

ساقی نامہ

"دلّی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصوّر تھے"

ابھی دو پہر بھی تو گزرے نہیں
خیابوں کے دل بھی تو دھڑکے نہیں
خموشی کے پنجے ابھی نرم ہیں !
ابھی ہوسش کی محفلیں گرم ہیں
پتنگے ہیں دیپک کے چاروں طرف
گہر مضطرب ہیں برائے صدف
ابھی سبزہ و گل پہ ہنستی ہے نیند
ابھی راستوں کی اچٹتی ہے نیند

ابھی چشمِ شاعر میں جلتا ہے خوں

تڑپتی ہے بحرِ فسونِ جنوں

ہواؤں کے جھونکے سُبک ہو چلے

ہر اک سمت سناٹے سو چلے،

اندھیروں کی زُلفیں سمٹنے لگیں

ستاروں کی شمعیں سسکنے لگیں،

ہوئی دیکھتے دیکھتے رات ختم

زباں پر نہ آئی ہوئی بات ختم

اُٹھا ساقیا چشمِ سحر آفریں

نکل آئے جلوت میں خلوت نشیں

یہ اسرار کیا ہے، یہ کیا بات ہے!
یہ ہنگام کیا ہے، یہ کیا رات ہے
ہوا ابلقِ وقت کیوں برق پا
حقیقت کے چہرے سے پردہ اُٹھا
مرے ساقیا! اے مرے ساقیا!
مجھے "تھام لے" "تھام لے" میں چلا

"میں صدقے ترے، اے مرے نغمہ گر!
پریشاں نہ ہو میری جاں اس قدر

وہی وقت ہے اور وہی رات ہے

یہ سب تیرے احساس کی بات ہے

یونہی سبزہ و گل پہ ہنستی ہے نیند

یونہی راستوں کی اُچٹتی ہے نیند

یونہی چشمِ شاعر میں جلتا ہے خوں

تڑپتی ہے بہرِ فسونِ جنوں

عجب برقِ جولاں ہے دریائے وقت

بہت بے مروّت ہے لیلائے وقت

اُسی کی ہے جس کے ہے بازو میں بل
دکھاتی ہے ورنہ یہ راہِ اجل

اُتر جا نہاں خانۂ وقت میں
اُلجھ کر نہ رہ بود میں ہست میں

چراغِ تصوّر جلا کر تو دیکھ
حجابِ من و تو ہٹا کر تو دیکھ

وہ بت ہیں ترے سینۂ سرد میں
اَٹے ہیں جو سو سال کی گرد میں

مرے نغمہ گر! اے مرے نغمہ گر

پریشاں نہ ہو میری جاں اس قدر"

○

اُلجھنے لگے میری نظروں کے تار

ہُوا ہر نفس نشترِ آبدار

جنوں — حیرت آبادِ گردش میں گم

خرد — دامِ صیّادِ گردش میں گم

یہ منظر — نہیں میرے بس کے نہیں

یہ شُعلے کسی خس کے بس کے نہیں

فضا میں ہے روشن دھندلکوں کی آگ

رگ و پے میں ساری ہے اشکوں کی آگ

یہ وہ درد ہے جس کا یارا نہیں

وہ دریا ہے جس کا کنارا نہیں

پلا ساقیا وہ مئے آتشیں

جلا دے جو دشتِ گمان و یقیں

○

رعایا کے راعی کے دل کا سرور

فقیروں، امیروں کی آنکھوں کا نور

فرشتوں نے کی باغبانی جہاں

رُکا آکے ہر کاروانی جہاں

جہاں رنگ بافی بہاروں نے کی

جہاں دیدہ بافی ستاروں نے کی

جسے حُسن کے سب چلن یاد تھے

جہاں عشق کے مُلک آباد تھے

تمدّن کے ٹکڑے نکھارے گئے

تصوّف کے گیسو سنوارے گئے

بہر گوشہ کعبے اُٹھائے گئے
بہر ذرّہ سجدے سجائے گئے
جہاں دردؔ کے علم و عرفان سے
ہزاروں سنائیؔ تھے حیران سے
جہاں میرؔ کے سوز پڑھ پڑھ کے لوگ
مناتے رہے عمر بھر دل کا سوگ
جہاں پادشاہِ نجفؑ کا غلام
وہ غالبؔ وہ اربابِ فن کا امام

پگھلتا رہا فکر کی آگ میں
سُلگتا رہا شعر کے راگ میں

وہاں اب نہیں جُز سکوتِ گراں
کوئی اہلِ نغمہ نہ اہلِ فغاں

جہاں تک نظر جائے سوُرج مکاں
ملے گا نہ سائے کا کوسوں نشاں

اندھیروں کا، ویرانیوں کا امیں
نہیں یہ نگہ شاہجہانی نہیں

خدا گے لئے ساقیا زہر دے
نہیں تو یہ ہوش و خرد چھین لے

○

مرے نغمہ گر! اے مرے نغمہ گر
کٹھن ہے بہت زندگی کا سفر
برابر ہیں یاں لطف ہوں یا ستم
تو اَم ہیں یہاں شادمانی و غم

نہیں صورتِ رم اِس آزار سے
یہ پتھر کٹے گا نہ تلوار سے
علاج اس کا غفلت کرے گی نہ سم
سموئے غزل میں یہ سب رنج و غم"

○

لرزتا اُٹھی شمعِ نظر، سو رہو
لٹا بیٹھے رختِ سفر، سو رہو

یہ شعلے بھڑکتے رہیں گے یونہی

نہیں اِس سے کوئی مفر، سو رہو

کسے ڈھونڈتے ہو یہاں کو بہ کو!

نہیں جز اجل چارہ گر، سو رہو

وہاں کون منزل کا رستہ دکھائے

جہاں خضر ہو در بدر، سو رہو

یہ سائے طلسمِ خیال و نظر

کڑی دھوپ ہے سر بہ سر، سو رہو

دعائیں ننھا جھوٹی تسلّی کا نام

دوائیں رہیں بے اثر، سو رہو

وہ محشر بپا ہے کہ شہرت، نہیں

کسی کو کسی کی خبر، سو رہو،

"مجموعہ خیال ابھی فرد فرد تھا"

راستے کتنے مختصر ہوتے

تم اگر میرے ہمسفر ہوتے

○

سانس لینے سے رہ ہے جاتے ہیں

تیرے افسانے لکھے جاتے ہیں

○

روکشِ خُلد یہ سب دشت و بیاباں ہوتے

کاش ہم دل کو لگا کر نہ پشیماں ہوتے

○

بکھیر کر شبِ غم اشک کے نگینوں کو

حریفِ عرش کیا ہم نے آستینوں کو

○

آسائشِ جہاں نے کس کس طرح جھنجھوڑا

لیکن تمہارے غم نے پل بھر نہ ساتھ چھوڑا

کون ہے جو یہاں آیا ہے پشیمان نہیں
زندگی خواب سہی، خواب بھی آسان نہیں

○

دل کو ہر فتنۂ عالم سے بچا لیتے ہیں
ہم ترے دھیان کی دیوار اُٹھا لیتے ہیں
اب یہ عالم ہے کہ جب یاد ستاتی ہے تری
اپنی تصویر کو سینے سے لگا لیتے ہیں

○

تڑپ لو یا ستم جینے کے سہہ لو
خود اپنے آپ سے ہر بات کہہ لو
ستارے بھی نہ جی بہلا سکیں گے
گھڑی بھر دل کے ویرانے میں رہ لو

قفس کا گوشہ تو ہے سلامت جو ہو گیا راکھ آشیانہ

ہزار تم نے بھلا دیا ہے مگر نہ بھولا ہمیں زمانہ

نظر ہلی، دل میں آگ بھڑکی، زباں ہلی، ہل گیا زمانہ

کلی تبسّم نہ کر چکی تھی کہ جاگ اُٹھی برقِ آشیانہ

○

کون لیتا ہے ترا نام گلی کوچوں میں

بُجھ گئیں شمعیں سرِ شام گلی کوچوں میں

کب تلک اُن کے لئے پھرتے رہو گے شہرتؔ

صورتِ ابلقِ ایّام گلی کوچوں میں

○

جن کی نوا سے تارے تھرّا کے رہ گئے ہیں

دو چار دن میں سُنّا سُنّا کے رہ گئے ہیں

کیوں جی گنوا رہے ہو صرصر گہہ جہاں میں
لاکھوں چراغ شہرت جھلا کے رہ گئے ہیں

○

شام سے پہلے ہی اُمید سحر ختم ہوئی
تھک گئے راہِ تجسّس نہ مگر ختم ہوئی
ہر قدم موت کو صد آبلہ پا دیکھا ہے
ایک فقرے ہی میں رودادِ سفر ختم ہوئی

○

یہ دو پل کے سائے غنیمت سمجھ لو
کڑی دھوپ کا منزلوں سامنا ہے

○

اپنی طرف بھی آنکھ اُٹھانا ہوا محال
ہم دل لگا کے ایسے پشیماں ہوئے کہ بس

دشتِ اُمید میں کانٹا بھی نہیں پاؤ گے

اپنے ہی سائے میں سو جاؤ اگر سونا ہے

○

تیرے ملنے سے سہل تر نکلا

سینۂ سنگ سے نمودِ شجر

○

آسماں پر یہ حسیں قوسِ قزح کا عالم

جیسے ٹوٹا ہوا ٹکڑا تری انگڑائی کا

○

یہ لوگ شمیمِ گُلِ گلزار کی مانند

ہوتے ہیں کسی کے نظر آتے ہیں کسی کے

○

دیکھے کوئی آکر جو یہ نقشہ تو نہ مانے

یہ منزلِ وحشت کبھی آباد رہی ہے

آسودگانِ گوشۂ منزل کو کیا غرض

راہیں جلیں، نشان جلیں، کارواں جلیں

○

نغمہ و شاعری ز سرتاپا

ہیں کرشمے تمام ترغم کے

○

ساقی مری طرف بھی یہ پگھلی ہوئی شفق

اک میں ہی نامراد و خراب نظر نہیں

○

کہوں تو ہونٹ جلیں، چپ رہوں تو دل ڈوبے

یہ ایک حرف تمنا بھی کیا قیامت ہے

○

ترے خیال کی خوشبو، نہ تیرے خواب کی چھاؤں

غمِ زمانہ نے پہنچا دیا کہاں دل کو

خدا کی شان کہ رہزن کے پاؤں دابتے ہیں
جو لوگ لائے نہ خاطر میں میرِ منزل کو

○

تمہیں سمجھنا زمانے کے بس کی بات نہیں
فروغِ محفل شہرتؔ ہنو ہوُا سو ہوُا

○

عشق میں راکھ ہوئے ہیں شہرتؔ
کیسے کیسے راج دُلارے

○

چہرہ اُترا ہوُا کیوں ہے ترا اے شامِ فراق
تیرے غم خواروں میں ہے شہرتؔ گم نام ابھی

○

یہ دل کا درد بھی شہرتؔ عجب قیامت ہے
کہ ہو تو سانس رُکے اور نہ ہو تو جی چاہے

بدگمانی سے سوا ہوتی ہے اُلجھن شہرتؔ
وہ کسے یاد کریں گے جنہیں ہم بھول گئے

○

اتنے بے چین ہو شہرتؔ تمہیں معلوم بھی ہے
وہ تمہیں اپنا سمجھتے ہیں تو دکھ دیتے ہیں

○

دعائے مرگ پہ یوں گُنگ ہے فضا شہرتؔ
کہ جیسے ہم نے خُدائی کی آرزو کی ہو

○

چاند رخ پھول بے ضیا شہرتؔ
اُن سا کوئی ملے تو کیسے ملے

○

رفتہ رفتہ غزل کے پردے میں
دل کی ہر بات کہہ گئے ہم بھی

"کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے"

"طاقِ ابرو" ــــــــ میری غزلوں کا پہلا انتخاب ہے جو آپ کی نظر سے گزرا . . . میرے پاس جو کچھ تھا کسی ایسے احساس کے بغیر جس پہ کمتری یا برتری کے احساس کی پرچھائیں بھی پڑی ہو، منتخب کر کے پیش کر دیا۔ مجھے معلوم ہے کہ اردو غزل کی تاریخ، اس کی روایت اتنی عظیم ہے اور اس محفل میں وہ گہما گہمی ہے کہ مجھ ایسے ہیچمیدان کو اپنی خرافات پیش کرتے ہوئے شرم آنی چاہیے مگر اس طوائف الملوکی کے عہد میں جہاں ہر بات ممکن ہے وہاں یہ کیوں نہیں ہو سکتا۔ تاہم اگر "طاقِ ابرو" دو چار لمحوں کے لئے بھی آپ کو تسکین پہنچا سکے تو میں اسے اپنی کامیابی جانوں گا۔

. . . یہ چند صفحے جن کے لئے آپ کو زحمت دے رہا ہوں نہ تو اپنی سوانح کے لئے رکھے ہیں کہ اپنی زندگی کے متعلق اس

سے زیادہ جانتا ہوں نہ یاد ہے نہ بیان کرنے کی سکت پاتا ہوں کہ

نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے
جو واں نہ کھچ سکے سو وہ یاں آکے دم ہوئے

نہ اس لیے کہ "میں شعر کیسے کہتا ہوں . . . " کہ یہ نسخہ مجھے آجتک معلوم نہیں ہو سکا ــــــ نہ شعر و شاعری یا ادبی نظریات پر کسی باقاعدہ بحث میں اُلجھنے کے لیے کہ اس کا دماغ کم از کم ہمارے یہاں اُن "علماء" کے سوا کسی اور کو نہیں ہو سکتا جو تخلیق کی محفل سے یا تو اُٹھ جاتے ہیں یا اُٹھا دیے جاتے ہیں اور نامردی کا لپکا اُن پر چور دروازے کھول دیتا ہے . . . نہ اپنی شاعری پر روشنی ڈالنے کی غرض سے کسی "مقدمے" یا "دیباچے" کی قسم کی چیز کی خاطر ــــــ بس یونہی جی چاہا کہ غزل کے ایک طالب علم کی حیثیت میں آپ سے چند باتیں کروں ــــ آپ کا دل مانے تو سُن لیں ورنہ میں تو غریب شہر ہوں ہی ــــ جہاں "جمالِ موصلیاں" اور "خمِ زلفِ کوفیاں" رکھنے والوں نے گوشہ گیری کے سوا تمام راستے مسدود کر دیے یہاں عزیز و اقارب کے بے پناہ "الطاف" نے گور کنارے پہنچا دیا اور میں ابدی سناٹوں میں ڈوبا ہوا میر کے اس شعر کی تفسیر بنا رہا۔

منہ تکا ہی کرے ہے جس تس کا

حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا

اور اپنی لغت کو گلے کے لفظ سے نا آشنا رکھا وہاں یہ بھی سہی ۔ ۔ ۔ ۔ اپنا گریبان پہلے بھی چاک کرتا رہا ہوں، آج بھی کر لوں گا ۔ ۔ ۔ ۔

یوں شعر اور قاری کے درمیان نثر کی مداخلت، وہ شاعر کی طرف سے ہو یا اس کے مداح نقاد کی طرف سے خود میرے لیے ہمیشہ جھنجھلاہٹ کا باعث رہی ہے ——— اور نثر بھی وہ جسے ہماری زبان میں "دیباچہ یا مقدمہ" کہا جاتا ہے ——— ان دیباچوں یا مقدموں میں سکہ بند تنقید کی طرح چند گھڑی گھڑائی، ثقیل، مرعوب کن اور بے معنی اصطلاحات استعمال کر کے مصنف کے بارے میں ایسے ایسے حیرت ناک بیان دیے جاتے ہیں کہ ایک مرتبہ تو خود صاحبِ کتاب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر آئینہ تلاش کرنے لگتا ہے ——— اور تو اور حالی ایسے ثقہ شاعر اور عالم نے اپنے دیوان پر مقدمے کے نام سے جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ ہمارے سامنے ہے یہ الگ بات ہے کہ ہماری بدنصیبی کی وجہ سے یہی مقدمہ ابھی تک ہماری تنقید کا واحد سرمایہ ہے ورنہ دو چار کے سوا ہمارے نقاد تو آج تک یہ بھی معلوم نہ کر پائے کہ غزل کیا ہے؟ یا یہ کہ غزل اور قصیدے میں ہیئت کے علاوہ کوئی چیز مشترک نہیں

اور یہ کہنا کہ قصیدے کے فلاں حصے (تشبیب) کو علیحدہ کر کے غزل بنا لیا گیا . . . کس قدر مضحکہ خیز ہے۔ گویا باقی جتنی مروّج اور متروک اصنافِ سخن ہیں اُن کی اصل قصیدے کے علاوہ کچھ اور ہے یا یہ کہ جہاں دو ہم شکل نظر آ جائیں اُنہیں باپ بیٹا مان لیا جائے ـــــــ اور پھر یہ بھی کہ وہ کون سے عناصر ہیں جن کی موجودگی چند منتشر اشعار کو ایک غزل بنا دیتی ہے ؟ ـــــــ کیا محض زمین کا ایک ہونا اس چیز کی ضمانت ہے کہ یہ اشعار ایک غزل کے ہیں ؟ ـــــــ فرض کیجیے میں آپ کے سامنے مختلف شاعروں کی ہم زمین غزلوں کے مختلف القافیہ اشعار یکجا کر کے رکھ دوں تو کیا آپ اُسے ایک غزل تسلیم کر لیں گے ؟ ـــــــ یقیناً آپ کا جواب نفی میں ہوگا۔ تو پھر کوئی نہ بات ایسی ہوگی جو مختلف الموضوع اشعار کو ایک لڑی میں پرو دیتی ہے۔ اگر صورتِ حال اس کے خلاف ہے، جیسا کہ عام طور سے خیال کیا جاتا تو پھر ماننا پڑے گا کہ کلیم الدین احمد سے بڑا کوئی صاحب ادراک نہیں۔ غزل محض قافیہ پیمائی کا نام ہے اور یہ صنفِ سخن جس پر ہم اتنا ناز کرتے ہیں یقیناً اس قابل ہے کہ دریا برد کر دی جائے ـــــــ پھر یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ ناسخ۔ شاہ نصیر ذوقؔ یا اسی دبستان کے دوسرے شاعروں کے ساتھ زمانے نے انصاف نہیں کیا کہ ان کے کلیات طاقِ نسیاں کی زینت ہو کر رہ گئے ـــــــ آپ میں سے جو حضرات شعر کہتے ہیں وہ میری اس رائے سے اتفاق کریں گے کہ بعض وقت ایک، دو

یا تین شعر ہوتے ہیں پھر آپ لاکھ جتن کر ڈالئے بات آگے نہیں بڑھتی حالانکہ بے شمار قافیے سامنے ہوتے ہیں ـــ پھر کبھی مہینوں بلکہ برسوں بعد جب وہی کیفیت طاری ہوتی ہے تو وہ ایک۔ دو یا تین شعر پوری غزل کا روپ دھار لیتے ہیں ـــ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے . . . ؟ معلوم ہوا کہ وہ کیفیت جس نے پہلے شعر کہلوائے تھے یا تو ابھی پوری طرح اس قابل نہیں ہوئی تھی یا اتنی مختصر اور مشتعل تھی کہ پوری غزل کا سانچہ اُسے قبول کرتا یا پھر بوجوہ آپ اس کی گرفت سے نکل جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ وہی آپ ہوتے ہیں جو فرمائش پر پچاس پچاس ایسے فی البدیہہ شعر کہہ جاتے ہیں جنہیں اپنی بیاض میں شامل نہیں کرتے . . . بحر کیسی ہی گنگناتی ہوئی ہو۔ قافیہ کتنا ہی کھنکتا ہوا ہو۔ ردیف لاکھ بولتی ہوئی ہو شاعر سے غزل نہیں کہلوا سکتی یہ سہرا کسی اور چیز کے سر ہوتا ہے ـــ جو لوگ غزل کے ڈھانچے کو دیکھ کر یہ خیال کرتے ہیں کہ اس کے مختلف شعروں میں کوئی ایسا رشتہ نہیں جو پڑھنے والے کو "نیم وحشی صنف سخن" کہنے پر مجبور نہ کر دے ـــ اُنہوں نے کبھی ٹھنڈے دل سے غور نہیں کیا کہ یہ بظاہر قطعی غیر مربوط خیالات۔ احساسات یا واردات کا ایک سانچے میں ڈھل جانا نہ تو قافیہ و ردیف کا کمال ہے نہ بحر کا اعجاز بلکہ اس میں ایک ایسی روح کارفرما ہوتی ہے جس میں رابطے کا تصوّر منطقی استدلال

اور بصری تسلسل سے بادرا ہوتا ہے۔ غزل کے اشعار میں اگر خارجی اتحاد پیدا ہو جائے تو اُسے یا تو قطعہ بند کہیں گے یا پھر ذرا قریب آنے کے لئے مسلسل غزل کا نام دیں گے مگر غزل جس صنفِ سخن کا نام ہے اس کا اتحاد سراسر داخلی ہوتا ہے جسے ہم آہنگیٔ احساس کہہ سکتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔

اردو میں غزل براہ راست فارسی سے آئی ہے۔ فارسی غزل کی ابتدا کب ہوئی؟ پہلا غزل گو کون تھا؟ یہاں اس سے بحث نہیں مگر وہ شاعر جس نے غزل کو ایک طلسماتی رس بخشا۔ ایک ملکوتی رنگ میں سمویا۔ ایک الوہی روح سے نوازا ایک ابدی خوشبو سے بسایا اور اس کی روایات منضبط کیں وہ سعدی ہے ـــــ سعدی کے بعد حافظ کا دیوان اُٹھا کر دیکھ لیں۔ ۔ پھر یہ صنف مرغوب عام ہوئی اور ہر موزوں طبع نے اسے تختۂ مشق بنانا شروع کیا۔ ظاہر ہے کوئی چیز خواہ کتنی ہی اعلیٰ اقدار کی حامل ہو جب عام ہو جاتی ہے تو اُس میں سستا پن اور بے راہ روی پیدا ہو جاتی ہے چنانچہ غزل بھی ہونے ہوتے جب ایسے بے بضاعت لوگوں کے ہتھے چڑھ گئی تو قافیہ بندی کے سوا کچھ نہ رہی مگر کچھ ہی مدت بعد بابا فغانی اور پھر خواجہ نظیری نیشاپوری نے اس ڈوبتے سفینے کو سہارا دیا۔ بہر کیف میں عرض یہ کرنا چاہتا تھا کہ سعدی۔ حافظ۔ فغانی اور نظیری کہ جن کے نام لئے بغیر ہم غزل کا تصور نہیں کر سکتے اُس غزل کا مزاج بنانے کے ذمے دار

ہیں جو ہمیں بے حد عزیز ہے اور جسے نظر انداز کر کے ہم اپنا دامنِ شعر تہی محسوس کریں گے۔ اس مزاج "میں جتنے عناصر کارفرما ہیں ان میں بنیادی عنصر وہی " آہنگِ احساس " ہے جسے آج بیشتر حضرات غزل کا مطالعہ اور اس پر بحث کرتے وقت نظر انداز کر دیتے ہیں . .

باتوں باتوں میں کتنی دور نکل آئے ——— حالانکہ شروع یہاں سے ہوئے تھے کہ شعر اور قاری کے درمیان کسی کو آنے کی اجازت نہ ہونی چاہیئے ——— شاعر کو جو کچھ کہنا ہوتا ہے وہ کہہ چکتا ہے۔ وہ اپنا دل کاغذ پر نکال کر رکھ دیتا ہے۔ اُسے کسی ترجمان کی ضرورت نہیں ہوتی کہ وہ تو خود پڑھنے والے کے دل کے چور کا سُراغ لگانے والا اور اس کے جذبات کا ترجمان ہوتا ہے . . اگر پڑھنے والا خوش ہو گیا تو سُبحان اللہ ورنہ اللہ اللہ خیر سلّا ———

شاعر جب اُس کیفیت میں ڈوبتا ہے جو شعر کی محرک ہوتی ہے اُس وقت اُس کے سامنے نہ کوئی قاری ہوتا ہے نہ سامع ——— کوئی نہیں ہوتا۔ وہ خود بھی نہیں ہوتا ——— یہ کائنات جس کی تخمیر ظلم و جہالت سے ، تخلیق سناٹوں اور دھندلکوں سے ہے . . . رنگوں ، نغموں اور خوشبوؤں کے سوا کچھ بھی نہیں رہتی ——— علم و عرفان سائے کی طرح ساتھ ساتھ پھرتے ہیں ——— سدرۃ المنتہٰی سے دل

کے آخری گوشے تک ایک دریائے نور موجزن ہوتا ہے جس کا نہ کنارا ہوتا ہے نہ تہ . . . . انہیں رنگوں نغموں خوشبوؤں اور روشنیوں سے ایک ناقابلِ تجزیہ شعلہ لپکتا ہے جو اپنے سوا ہر چیز کو راکھ کرتا ہوا شعور کی حدوں میں داخل ہوتا ہے . . . . بالکل لاوے کی طرح . . . . یہاں لفظ دامن پھیلائے منتظر ہوتے ہیں — اب یہ لاوا پھولوں اور ستاروں کا روپ دھار لیتا ہے اور ہمیشہ کے لیے دل و دماغ کی زینت بن جاتا ہے — شعور کی حدوں میں داخل ہونے سے پہلے کے تمام عمل پر نہ شاعر کو اختیار ہوتا ہے نہ آپ اور میں اُسے مجبور کرنے کا حق رکھتے ہیں کہ اِس آنسو کو پرو دیتا جو موتی کہلاتا اور اُس قطرے کو نذرِ خاک کر دیتا کہ اُسی کا رزق تھا — خیال پر پابندی عائد نہیں کی جا سکتی وہ ہر زنداں میں بیاباں نوردہے گا البتہ جب الفاظ کی قبا اوڑھ لیتا ہے تو قاری کو اختیار حاصل ہو جاتا ہے کہ ممکن شدت سے احتساب کرے ۔ یہ مرحلہ بے حد کٹھن اور نازک ہوتا ہے — یہیں شاعر اور قاری کھل کر ایک دوسرے کے سامنے آتے ہیں اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے شاعر کی فن کاری اور اس کی فہم و فراست کا امتحان شروع ہوتا ہے ۔

زبان و بیان کیسی چیزیں ہیں ؟ ان کا تعلق بہت حد تک وجدان سے

نہیں ہوتا۔ جو لوگ اِس عقیدے کے حامی ہیں کہ شعر کی تخلیق کے وقت الفاظ ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں وہ سخت بے خبری اور ناتجربہ کاری کی بات کرتے ہیں۔ شاید ہی کوئی شعر ایسا ہوتا ہے جو اپنی اولین صورت میں قائم رہتا ہے۔ شاعر کو جب تک اس کے ہوش و حواس رہتے ہیں اور جب تک اس کے دم میں دم ہے ترمیم و تنسیخ کرنا ہوتی ہے۔ بعض اوقات ایک ایک حرف کے لیے صبح کو شام اور شام کو صبح کرنا ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی خیال کے سوا ایک ایک نقطہ بدل جاتا ہے —— یہاں اگر غالبؔ کا یہ شعر آپ کو یاد دلاؤں تو بے محل نہ ہوگا۔

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

جذبہ کیسا ہی قابلِ قدر ہو، خیال کتنا ہی ارفع و اعلےٰ ہو اگر بیان کے شیشے میں پوری طرح نہیں اُتر پایا تو قطرہ، قطرہ ہی رہ گیا —— گہر نہیں ہو سکا —— یہ درست ہے کہ بعض اوقات خیال اتنا نازک اور جذبہ اتنا لطیف ہوتا ہے کہ جس لفظ یا جس پیرائے میں اپنی خام صورت میں ڈھل جائے اگر اُس کو بدل دیا جائے تو مافی الضمیر واضح نہیں رہتا یا وہ شدت باقی نہیں رہتی جس کا تقاضا ہوتا ہے

اور شاعر کو فن کے مسلّمہ قواعد و ضوابط سے انحراف کرنا پڑتا ہے — لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ہم اپنی لغزشوں پر یہ کہہ کر پردہ ڈال لیں کہ "میں جائز خیال کرتا ہوں" — اجتہاد، ناواقفیت اور گمراہی میں فرق ہے نا؟ . . .

یہ جو کچھ میں نے کہا ہے اس سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ میں بیان کو خیال یا جذبے پر فوقیت دینے کا قائل ہوں — زبان و بیان کی طرف اس شدّ و مدّ سے توجہ منعطف کراتے وقت دو باتیں میرے پیشِ نظر ہیں۔ ایک تو یہ کہ میں نے یہ بات فرض کر لی ہے کہ شاعر صرف انہیں خیالات، جذبات اور واردات کے چراغ حریمِ شعر میں روشن کرتا ہے جو عامیانہ پن کے صحراؤں میں نفسِ عیسیٰ کے بادِ صفت روشنی سے محروم رہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ آج کے شاعر، سامع، قاری اور نقّاد مواد کی طرف زیادہ دھیان دیتے ہیں اور زبان کے اسرار و رموز سے بے اعتنائی برتتے وقت یہ نہیں سوچتے کہ یہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں یا سوچ رہے ہیں زمانہ اُسے سو سو طرح کسوٹی پر کسے گا اور یہ بھول جاتے ہیں کہ موضوع، بیان میں چولی دامن کا ساتھ ہے . . . اس وبا کے لئے وہ بزرگ ذمّے دار ہیں جو ادب و شعر کو "مقصدیت" کی دلدل میں کھینچ لائے تھے۔

ذاتی طور سے میں شعر کو چھوٹی موٹی تسلیم کرنے سے منکر ہوں لیکن میں شعر کی گراں جانی پر بھی ایمان نہیں لا سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی چیز اپنی جگہ نہ بری ہے نہ بھلی۔ بنانے والا اُسے جو چاہے بنا دے اسی طرح مقصدیت ہو یا کوئی اور تحریک جب تک شاعر کی روح میں یوں جذب نہیں ہو جاتی کہ خود اس کے لیئے علیحدہ کرنا غیر ممکن ہو جائے تب تک یا نقالی ہو گی یا فریب دہی اور دروغ گوئی — اقبالؔ کی مثال ہمارے سامنے ہے پھر اُس کے مقلدین کا عبرت ناک انجام بھی ہم دیکھ چکے ہیں۔ اقبالؔ کی عظمت کا راز محض اس میں نہیں کہ وہ مقصدیت کا قائل تھا یا اس کے سامنے ایک خاص آئڈیل تھا بلکہ اس کی فنکاری بھی اُسی قدر ضامن ہے۔

مذکورہ تحریک نے ایک اور ستم یہ ڈھایا کہ ہمیں روایت سے یہ کہہ کر دور تر کر دیا کہ امیر خسروؔ سے غالبؔ تک کا تمام سرمایۂ شعر جاگیرداری عہد کی یادگار ہے اور آج کے سائنس اور جمہوریت کے زمانے میں نہ صرف بیکار ہے بلکہ مضحکہ خیز بھی — اگر کوئی اُس طرف نظر اٹھا کر دیکھے گا تو وہ "روایت پرست" اور "قدامت پسند" ہو گا — اپنے آباؤ اجداد اور اُن کے کارناموں سے نفرت کے اس بیج نے جس درخت کو جنم دیا وہ نہ تو سورج کی تمازت

سے پناہ دے سکا نہ تو سے — روایت پرستی یقیناً ذہنی افلاس اور علمی کس مپرسی کا سراغ دیتی ہے لیکن جب تک ہم روایت کی چھاؤں میں نہیں سستائیں گے جدیدیت کا سفر کیسے طے کر سکیں گے جب تک ہم یہ معلوم نہ کر لیں گے کہ کس نے کس منزل پہ علم گاڑا اپنی منزل کا تعین کیسے کر سکیں گے — مجھے نہیں معلوم ہمارے علماء اس معاملے میں کیا فتوے صادر فرماتے ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ "شعر اگر شعر ہے تو پھر وہ قدیم کیسے ہو گیا" — ایمان سے کہیں اگر کوئی ان اشعار کو قدیم اور فراموش کرنے کے قابل بتائے تو آپ کیا کہیں گے۔؟

شمارِ شوق نہ دانستہ ام کہ تا چند است
جز ایں قدر کہ دلم سخت آرزومند است (خانخاناں)

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ ہم دور شد (ملک قمی)

عرفی بوقتِ نزع رسیدی و بہ شدی
شرمت نہ آید از دلِ امیدوارِ دوست (عرفی)

رفتی بہ بزمِ غیر و نکو نامیٔ تو رفت
ناموسِ صد قبیلہ بیک خامیٔ تو رفت (نظیری)

ہمہ عمر با تو قدح زدیم و نہ رفت رنجِ خمارِ ما
چہ قیامتی کہ نمی رسی ز کنارِ ما بہ کنارِ ما (بیدلؔ)

عجب کچھ لطف دیتا ہے شبِ خلوت میں جاناں سوں
سوال آہستہ آہستہ، جواب آہستہ آہستہ (ولیؔ)

کیا بدن ہوگا کہ جس کے کھولتے جامے کے بند
برگِ گل کی طرح ہر ناخن معطّر ہو گیا (یقینؔ)

وے صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب دیکھنے کو جن کے انکھیاں ترستیاں ہیں (سوداؔ)

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے (میرؔ)

یہ بڑے ستم کی بات ہے اور بے حد عبرت ناک منظر کہ ہم ہومر، ورجل، شیکسپیر وغیرہ کو پڑھتے وقت اُن کی تاریخِ وفات بھلا دیں مگر میرؔ، سوداؔ، مصحفیؔ، جراٗتؔ، مومنؔ اور غالبؔ کے نام پر ناک بھوں چڑھائیں۔ اگر میرؔ سے غالبؔ تک کوئی شاعر محض اس لئے ہماری رہنمائی نہیں کر سکتا کہ اُن کے یہاں ہمارے دکھوں کا مداوا نہیں تو پھر مغرب کے مرقومہ بالا اور دیگر شاعر ہمیں کیا تسکین فراہم کر سکتے ہیں۔ یقیناً کوئی شاعر اپنے گرد و پیش سے بے خبر نہیں ہو سکتا۔ وہ اُن آبادیوں اور ویرانوں

سے منہ نہیں موڑ سکتا جو اُس سرزمین پہ واقع ہیں جہاں وہ سانس لے رہا ہے۔ اپنے زمانے کی دھڑکنیں اس کے نقطے نقطے میں محسوس ہوں گی اگر ایسا نہیں ہے تو پھر نہ تو اس کا ذکر کرنا چاہیئے نہ اس سے توقع رکھنی چاہیئے اس لیئے کہ پھر وہ شاعر ہی نہیں ہے۔ ع

ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو

مگر یہ فیصلہ کرنے سے پہلے ہمیں سو مرتبہ غور کر لینا چاہیئے کیونکہ شعر کی روح تک پہنچنے کے لیئے بے شمار نقابیں اُٹھانا ہوں گی غزل کے معاملے میں یہ مسئلہ اور بھی کٹھن ہو جاتا ہے ایک اس لئے کہ غزل کی جڑیں روایت میں اتنی دور چلی گئی ہیں کہ اُنہیں اکھاڑ پھینکنے کا مطلب اُسے موت کا پیغام دینا ہوگا اور کسی صورت میں بھی ہم روایت سے بے خبر رہ کر غزل کی تفہیم کے مدعی نہیں ہو سکتے (یہاں یہ واضح کرنا ضروری محسوس ہو رہا ہے کہ میں روایت کا لفظ انگریزی لفظ TRADITION کے مترادف برت رہا ہوں نہ کہ CONVENTION کے)۔ دوسرے اس لئے کہ غزل اُن نازک، لطیف اور ناقابل تفسیر و تجزیہ واردات اور کیفیتوں کی آئینہ دار ہوتی ہے جنہیں فقط محسوس کیا جا سکتا ہے۔ غزل کا تعلق آپ کے اُن دکھوں اور اُن سکھوں سے ہے جن کی تشہیر آپ کو گوارا نہیں لیکن تقاضائے بشریت

......کے تحت زبان پر نہ لائیں تو سکتہ ہو جائے لہٰذا اشاروں کنایوں میں کہہ گزرتے ہیں اس طرح کہ جو اس عالم سے دوچار ہو چکا ہے وہ بھی اور جو ان راہوں سے نابلد ہے وہ بھی محسوس کر لے۔ یہ صحیح ہے کہ غزل اور دیگر اصنافِ سخن میں ایک قدر مشترک ہے جسے "آہنگ" کا نام دیا جاتا ہے لیکن آپ محسوس کریں گے کہ اس اشتراک میں ایک خاص فرق ہے غزل کا آہنگ ایک عجیب قسم کے سکون کا حامل ہوتا ہے۔ اسے کسی واضح خارجی تحریک کی ضرورت نہیں ہوتی یہ اپنی آگ کا آپ ہی خس وخاشاک ہوتا ہے.... غزل گو اپنے دکھ میں دوسروں کو شرکت کی دعوت نہیں دیتا، سرِ محفل آنسو بہانا اس کے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ وہ کونوں میں چھپ چھپ کر خون روتا ہے مگر یوں کہ نہ پلکوں کو خبر ہو نہ آستین کو معلوم ہو.... یہ اس کی فطرت کے خلاف ہے کہ وہ سننے والوں کے جذبات کو ہوا دے اور یوں اپنی تنہائیوں یا ویرانیوں کا ساتھی بننے کی تلقین کرے۔ اس چھپ چھپ کر رونے یا مسکرانے اور اپنی طول طویل داستانوں کو چند لفظوں میں بیان کرنے ہی کو اربابِ علم نے رمز و ایما کا نام دیا ہے اور یہی غزل کی جان ہے۔

بہ ہینہ حرف نہ گفتن کمالِ گویائیست
حدیثِ خلوتیاں جُز بہ رمز و ایمائیست (اقبالؔ)

شاعر کا ذہن جتنا بالغ۔ تخیّل جتنا بلند پرواز۔ دل جتنا حسّاس اور جذبہ جتنا گمبھیر ہوتا چلا جائے گا اُس کی تخلیق میں اُتنا ہی ایجاز۔ تنوع اور اشاروں، کنایوں اور علامتوں وغیرہ کے باعث اشکال؟ پیدا ہوتا چلا جائے گا ——— دو اور دو چار والی بات کم از کم غزل میں ہرگز نہیں چلتی ——— خواجہ حافظؔ شیرازی کی سرمستی اور گم کر دینے والے کیف سے انکار کفر ہے (جناب امداد امام اثرؔ صاحب "کاشف الحقائق" سے معذرت کے ساتھ) واقعہ یہ ہے کہ جو آسودگی۔ جو اُڑان اور جو ولہ بالیؔ نظیریؔ، عرفیؔ، بیدلؔ اور غالبؔ کے یہاں نصیب ہوتی ہے خواجہ صاحب اس سے محروم ہیں۔ پڑھنے والا اگر ذوقِ سلیم رکھتا ہے تو اپنی اُفتادِ طبیع اپنے ذہنی، بدنی اور جذباتی تجربے اور اپنے ماحول کی روشنی میں جوں جوں نقابیں اُلٹتا جائے گا۔ نگاہیں خیرہ ہوتی چلی جائیں گی ——— جیسے جیسے گرہیں کھولتا جائے گا۔ ناخن معطر ہوتے چلے جائیں گے ... یہ نقابیں یا گرہیں بیان میں بھی ہوتی ہیں اور جذبے میں بھی۔ ہم لوگ انہیں "ابہام" کا نام دیتے ہیں۔ حالانکہ اول تو اشکال و

ابہام میں بُعد المشرقین ہے دوسرے میرا عقیدہ ہے کہ کوئی شعر مبہم نہیں ہو سکتا ـــــ آخر کہنے والے کے ذہن میں ـــــ اگر متوازن ہے ـــــ کوئی بات تو ضرور ہو گی یہ الگ بات ہے کہ ابلاغ میں خامی رہ گئی ہو یا ہماری رسائی نہ ہوئی ہو ـــــ اُستاذی سید عابد علی عابدؔ کا یہ قول مجھے کبھی نہیں بھولتا کہ "غزل کے شعر کے لیے ہمیں یہ نہ کہنا چاہیے کہ شاعر نے یوں کہا ہے بلکہ یہ کہ میری سمجھ میں یوں آتا ہے . . . . " غالبؔ پر سب سے بڑا اعتراض یہی رہا ہے کہ وہ مبہم ہے . . . . ایک مشہور نقاد نے اپنے ایک مضمون میں اُس کا یہ شعر مبہم کہہ کر پیش کیا ہے کہ

عرض کیجیے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

اور سوال اُٹھایا کہ "کہیں خیال سے صحرا جلے ہیں ؟" ـــــ دیکھا آپ نے ؟ اب بتائیے آپ یا میں اُن کا کیا بگاڑ سکتے ہیں ؟ غالبؔ کس کے سامنے جا کے فریاد کرے ؟ ـــــ کاش انہیں کوئی یہ بتا دے کہ یہ رونا رویا گیا ہے اپنے عہد کی کور ذوقی اور بدمذاقی کا ـــــ ماتم کیا گیا ہے بھری دنیا میں اکیلے پن کا ـــــ

غزل تفصیل یا جزویات کی متحمل نہیں ہوتی ۔ وہ آبگینہ جو تندیٔ صہبا سے پگھل جائے گندھک اور چونے کے ڈلوں کے سامنے کیا ٹھہر سکے گا۔ واقعات اور حادثات کی تصویریں تو غزل گو کے دل میں ہوتی ہیں ۔ وہ ان تصویر دل کے سامنے بُت بنا کھڑا رہتا ہے ۔ ہفتوں، مہینوں بلکہ برسوں . . . پھر یکایک کچی کونپلوں سے بھی ملائم انگلیاں اُسے پیار سے چھوتی ہیں ـــــ رگ و پے میں ایک بجلی سی سرایت کر جاتی ہے ـــــ نسیم سحر کا کوئی جھونکا اس کے دل کے جھروکوں سے ذرا سا پردہ سرکا دیتا ہے . . . ایک ہزار رنگ روشنی مسکراتی ہوئی باہر جھانکتی ہے اور آنے والے زمانے کا دھندلکوں میں آتا ہوا کشکول جگمگا اُٹھتا ہے ۔ اب اگر ہم اس روشنی کا تجزیہ کرنے لگیں تو نتیجہ معلوم ـــــ عطر کی روح پرور لپٹوں سے محظوظ ہونے کی جگہ اگر ہم گندھی سے مطالبہ کریں کہ ہمیں وہ تمام جڑی بوٹیاں، وہ تمام ادویات، وہ تمام پھول دکھائے جن سے یہ عطر کشید کیا گیا تھا تو وہ ہماری کیا مدد کر سکے گا اسی طرح ہم اُن واقعات اور حادثات کو ان کی ٹھوس شکل میں دیکھنا چاہتے ہیں جنھیں شاعر اپنی روح میں دفن کر چکا ہے ۔ وہ اب ہمیں کیا دکھائے ؟ کیسے دکھائے ؟ اگر ہم تھوڑا سا خلوص برتیں ۔

ذرا سی ہمت کریں اور اس مقام تک پہنچنے کی کوشش کریں جہاں یہ حدود اور اوجھل ہو جاتے ہیں تو ہم محسوس کریں گے کہ غزل کیا ہے ۔۔۔ پھر ہم نظم یا افسانے یا مضمون کی طرح معنی کی جستجو نہ ہو گی ۔ یہ آسمان اور یہ زمین تو ہم دیکھ ہی رہے ہیں اگر شاعر بھی انہیں ویسے ہی دکھا دے جیسے وہ ہیں تو کیا آپ کے نزدیک یہ تکرار دل خوش کن ہو گی ؟ ۔۔۔ شاعر کا کمال تو یہ ہے کہ وہ ہمیں اس روح سے متعارف کرائے جو کائنات کی تہ میں کارفرما ہے ۔۔۔ وہ اُن گوشوں سے نقاب اُلٹ دے جن تک ہماری نگاہوں کو رسائی حاصل نہیں ۔۔۔ ہمارے لئے وہ محدّب شیشہ مہیّا کرے جو آفتاب میں ذرہ اور قطرے میں دجلہ دکھلائے ۔۔۔ اگر ہم ان منزلوں کے سائے میں سستانا چاہتے ہیں تو محض مادی ذرائع کارآمد نہ ہوں گے ۔۔۔ لغت منزل کی نشان دہی ضرور کر سکتی ہے ۔۔۔ منزل تک پہنچا نہیں سکتی ۔۔۔ روح تک رسائی روح کے ذریعے ہو سکتی ہے اور غزل ہمارے ادب کی روح ہے ۔

یہاں میں قرآن مجید کی مثال نہیں دوں گا کہ سوء ادب ہے لیکن ایک بہت قریب کا تجربہ ضرور عرض کروں گا ۔۔۔ غالب کا یہ شعر جب پہلی مرتبہ پڑھا کہ

سُن اے غارت گرِ جنسِ وفا سُن
شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا

تو کبھی دن میرا دل ٹھہر نہ سکا تھا حالانکہ آج بھی اگر آپ مجھ سے کہیں تو میں وہ تصویریں آپ کو دکھا نہ سکوں گا جسے میری روح نے دیکھا تھا اور اس وقت بھی دیکھ رہی ہے۔۔۔ کیا کوئی شارح اس شعر کی کیفیت الفاظ میں منتقل کر سکتا ہے۔

مصائب اور تھے پر دل کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے (میر)

آپ اسے سُن کر سر دُھنیں گے مگر بتا نہیں سکیں گے کہ کیوں۔۔۔ بس اسی کا نام غزل ہے اور وہ چیز جو بے اختیار آنسو بھر لائے، چُپ سادھ لینے یا تبسم کرنے پر مجبور کر دے تغزل کہی جا سکتی ہے جس کی شرح اس سے زیادہ کیا ہو کہ شاعر نے وہ آنچ پڑھنے والے کے سینے میں لبادی جو اُس کی ہڈیاں پگھلا رہی تھی۔ یہ تغزل، سپردگی۔ محویت۔ طہارت۔ صداقت۔ مانوسیت اور خلوص کے بغیر نشو و نما نہیں پا سکتا ــــ غزل گو کو اپنی پوری شخصیت، اپنا سب کچھ انتہائی سچائی۔ پیار اور دردمندی سے اُن حقائق میں تحلیل کرنا ہوتا ہے جو ازل سے ابد تک سورج کی طرح تابندہ

ہیں اور جنہیں وقت کی کوئی گردش۔ معاشرے کا کوئی انقلاب کچلا نہیں سکتا۔ . . . سطحیت اور چوما چاٹی۔ ذہنی اور جذباتی انتشار۔ رکیک اور گھناؤنے احساسات یا جذبات غزل کے لیے زہر ہلاہل ہیں۔

غزل وہ صنف ہے جسے آئینہ خانے سے تشبیہہ دی جا سکتی ہے کہ ہر طبقے۔ ہر عقیدے اور ہر عمر کا انسان ہر زمانے میں اپنی صورت دیکھ سکتا ہے البتہ جو حضرات اس کی مدد سے سیاسی اور سماجی قسم کی تاریخ مدوّن کرنا چاہتے ہیں انہیں ہمیشہ مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے . . . یہ بڑی مصیبت ہے کہ ہم لوگ ہر صنفِ ادب سے ایک سی توقعات وابستہ کر لیتے ہیں اور نہیں سوچتے کہ آخر یہ ویسی اصناف کیوں وجود میں آئیں — کیا افسانے۔ ڈرامے اور ناول میں ہیئت کے علاوہ کوئی فرق نہیں ؟ — ہے نا :— تو پھر غزل۔ مثنوی اور نظم کی مختلف اصناف میں بھی تو کوئی فرق ہوگا ؟ آخر کوئی تو بات ہوگی جو ایک شاعر عمر بھر نظم کی محفل میں چراغ روشن کرتا رہتا ہے اور دوسرا غزل کی خانقاہ میں دھونی رمائے بیٹھا رہتا ہے — ! اور کیا دوسری زبانوں کے اصولِ نقدِ شعر یہاں بھی کارآمد ہو سکتے ہیں جب کہ فارسی کے سوا کسی اور

کے پاس یہ کانچ کے پیالے نہیں جو سائنس کی گرمی نہ سہہ سکیں ؟ —

بس یہ سوال تھے جو اپنی تنقید کے مطالعے سے اکثر و بیشتر میرے ذہن میں اُلجھنیں پیدا کرتے رہے ہیں۔ حالانکہ تنقید کا بنیادی مقصد ادب اور قاری کے درمیان افہام و تفہیم پیدا کرنا اور اسکی الجھنوں کو سلجھانا ہے اس معاملے میں یقیناً آپ میرے ہم خیال ہوں گے۔

خدا کے لیئے ذرا غور تو فرمائیں کہ آج ۱۹۵۸ء میں

"بازناں عشق بازی کردن"

وغیرہ غزل کی تعریف کی جا رہی ہے حالانکہ یہ اور اسی قسم کی دوسری باتیں اس کی بے شمار صفات میں سے ہیں۔ یہی نہیں ہیں۔ یہی نہیں رہیں — ع

ہزار نکتۂ باریک تر ز مو اینجاست

اب ایک ایسی بات عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں جس کا براہِ راست تعلق آپ سے تو نہیں لیکن اگر رہ گئی تو عمر بھر دل پہ بوجھ سا رہے گا — سید عابد علی عابد میرے بڑے ہی پیارے اُستاد ہیں۔ اپنی نالائقیوں، گستاخیوں اور نافرمانیوں کے باوجود اُن کی حوصلہ افزائیوں اور شفقتوں کے ماتھے پہ آج تک شکن نہیں دیکھا۔ ناگفتہ بہ خرابئ صحت کے باوجود انہوں نے "طاقِ ابرو"

میں مشمولہ غزلوں کے انتخاب اور ان کی ترتیب وغیرہ کے سلسلے میں مشوروں سے نوازا۔ میں ان کا بے حد ممنون ہوں۔ ایک بات بتا دوں کہ شاہ جی جتنے میٹھے اور نرم دکھائی دیتے ہیں اندر سے اتنے ہی کڑوے اور سخت گیر ہیں اور بے حد دبنگ۔ آپ اُن سے بحث نہیں کر سکیں گے۔

شاہ جی کے علاوہ شاعری کے سلسلے میں اپنی گردن پر جناب احسان دانش۔ حضرت یوسف ظفر اور "حلقۂ اربابِ ذوق" کے ایسے احسان لئے ہوئے ہوں کہ ان کا اعتراف نہ کرنا میری اُس وضعداری کے خلاف ہے جو مجھے ورثے میں ملی ہے اور جس پر مجھے فخر ہے۔ جناب احسان دانش نے آج سے اٹھارہ برس پیشتر اس وقت میری اُنگلی پکڑی جب بقول کسے ع

بات تک کرنی نہ آتی تھی "مجھے"

یہیں حضرت یوسف ظفر سے ملاقات ہوئی جو بہت جلد دوستی کا رنگ اختیار کر گئی۔ ظفر صاحب نے اپنے مشوروں کے علاوہ سب سے بڑا کرم یہ کیا کہ مجھے "حلقۂ اربابِ ذوق" کا راستہ دکھایا۔ حلقے سے میں نے کیا کچھ اور کتنا کچھ پایا یہاں اس کا موقع نہیں

میں نے آپ کا بہت سا وقت شاید خراب کیا ہے۔ معذرت خواہ ہوں مگر کیا کروں کہ بات غزل کی چھڑ گئی تھی۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گردد

شہرت بخاری
۱۶ اپریل ۱۹۵۸ء

۲۲۔ ہجویری سٹریٹ
شیش محل روڈ۔ لاہور

J. & K. UNIVERSITY LIB.
Acc. No ...... 55064 ......
Date .... 20.XI. 64.

ALLAMA IQBAL LIBRARY
55064



ALLAMA
IQBAL LIBRARY
UNIVERSITY OF KASHMIR
HELP TO KEEP THIS BOOK
FRESH AND CLEAN

ALLAMA
IQBAL LIBRARY
UNIVERSITY OF KASHMIR
HELP TO KEEP THIS BOOK
FRESH AND CLEAN.